اقبالیات
از
مولانا غلام رسول مہر
مرتب
امجد سلیم علوی
SHAHEEN 87

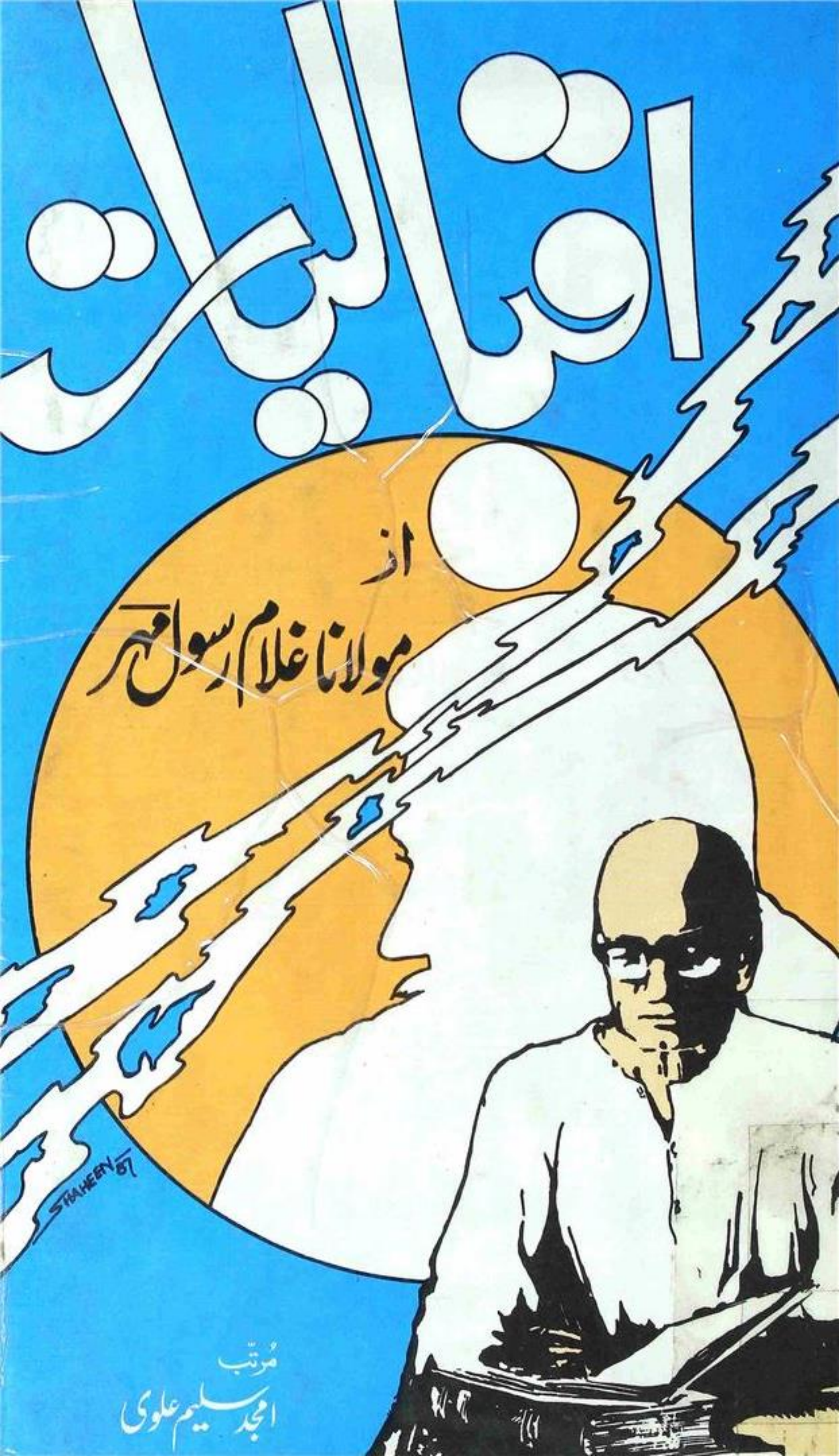

سلسلۂ مطبوعات (۲)

اقبالیات

از

مولانا غلام رسول مہر مرحوم و مغفور

مُرتّبہ

امجد سلیم علوی

ناشر

مہر سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ سلام سٹریٹ۔ مسلم ٹاؤن۔ لاہور

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ

نام کتاب ________ اقبالیات

مصنّف ________ مولانا غلام رسول مہر

مرتّب ________ امجد سلیم علوی

سرِ ورق ________ محمد شریف گل

گرد پوش ________ فاروق شاہین

بار ________ اوّل

سالِ طباعت ________ ۱۴۰۹ھ / ۱۹۸۸ء

تعداد ________ ایک ہزار

سائز ________ ۲۳ × ۳۶ / ۱۶

مطبع ________ نقوش پریس، لاہور

ناشر ________ مہر سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ سی سٹریٹ، مسلم ٹاؤن، لاہور ۱۶۔

قیمت ________

ISBN 969-8021-00-0

فہرست مضامین

۱ - پیش لفظ	۵
۲ - علّامہ سے تعارف	۷
۳ - علّامہ اقبالؒ کی زندگی کا آخری دور	۲۶
۴ - حضرت علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ	۴۱
۵ - اقبالؒ کی شخصیّت	۴۶
۶ - اقبالؒ دیارِ مغرب میں	۵۰
۷ - کلامِ اقبالؒ کا حقیقی مقام	۵۷
۸ - علّامہ اقبالؒ کا نظریۂ حیات	۶۷
۹ - علّامہ اقبالؒ اور افریقہ کی آزادی	۷۰
۱۰ - اقبالؒ اور تربیتِ عوام	۸۰
۱۱ - علّامہ اقبالؒ اور مولانا آزادؒ	۹۱
۱۲ - علّامہ اقبالؒ اور مولانا آزادؒ	۹۸
۱۳ - ارمغانِ حجاز کی ایک رباعی کا معاملہ	۱۱۲
۱۴ - شکوۂ اقبالؒ اور جلسۂ انجمن	۱۱۸

۱۵ - خضرِ راہ	۱۲۵
۱۶ - اسرارِ خودی	۱۳۵
۱۷ - پیامِ مشرق	۱۷۵
۱۸ - سرودِ رفتہ	۱۸۱
۱۹ - مکاتیبِ اقبالؒ بنام گرامی	۲۲۵
۲۰ - اقبالؒ درونِ خانہ	۲۳۲
۲۱ - اقبالؒ روزنامچۂ مہر میں	۲۴۸

○

مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی تحریر کا عکس

Ghulam Rasul Mehr

MUSLIM TO

LAHORE 196

برادر مکرم

جی ہاں ۔ علامہ مرحوم کے اس شعر کو پہلے بھی بعض ارباب تحقیق نے مہمل قرار دیا تھا اور اس پر خیالات میں بحث ہوئی تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی پیچیدگی ہے اور نہ اصل مطلب تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش آتی ہے ۔ آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ نرگس کی بے نوری کا اظہار ہے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ رونے کی علت یہی بے نوری ہے لیکن آپ نے یہ مفہوم شاعر کے الفاظ سے پیدا کیا کہ "تشبیہاً" کہ چمن میں ایک دیدہ ور پیدا ہو گیا ہے جو شاعر نے حقیقت یہ کہا ہے:

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

آپ غور فرمائیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ اس کا مطلب ہرگز وہ نہیں جو آپ نے پیش کیا ہے ۔ نرگس کا ہزاروں سال اپنی بے نوری پر روتے رہنا ایک واقعہ ہے ۔ رونا اس لیے ہے کہ اس کی آنکھ نور بصیرت سے محروم ہے ۔ شاعر کہتا ہے کہ چمن میں دیدہ ور کا پیدا ہونا بہت مشکل ہے ۔ نرگس کا ہزاروں سالہ گریہ اس مطلب کے لیے یقینی طور پر بے سود نہیں سمجھا جا سکتا ۔

یہ تو شعر کے اصل الفاظ کا معاملہ تھا ۔ اب آپ اس سے الگ ہو کر مضمون پر غور کریں ۔ شاعر محض یہ بتانا چاہتا ہے کہ دیدہ ور سہل الحصول یا یسیر الحصول شے نہیں ۔ اس سلسلے میں اس نے ساتھ نرگس کا معاملہ اٹھایا ۔ نرگس کی بے نوری کا ذکر کرتے ہوئے اس نے دنیا میں عام اظہار کی کوشش کی ۔ [illegible] یہ نہیں کہا کہ نرگس کا ہزاروں سالہ گریہ ایسے دیدہ ور پیدا کرتا ہے کہ محض یہ کہا کہ دیدہ ور ایسی

دیدہ ور ... ہوا

بیش بہا تحفے ہیں، جس کے لیے نرگس ہزاروں سال کا سفر طے کر لیتا ہے۔ جو ہمیں بہت مطلوب تھا

نازل ہوتا ہے، دور سے جوہر کا وہ وضع، روشن ہوا، یہیں تک پہنچ سکا یعنی دیدہ ور کا

آسانی سے میسر نہیں آتی۔

یہی وہ وضع ہے جو شاعر دیا ہے مدعا ... قرآن کی شکل دیا پیش کیا گیا

ہیں۔ اس کی منطق ہے، اس کا طریق استدلال اور اس کا انداز تفہیم سب سے الگ ہوتا ہے

آپ نے مصرعہ ثانی میں جو مطلب نکالا ہے، اس کے لیے الفاظ سامنے معلوم نہیں ہوتے

شاعر صرف دیدہ ور کی تقاضے بے جا کی نشاندہی کرتا ہے پر زور دے رہا ہے

نہیں کیا تھا کہ نرگس کے ہزاروں سال تک روتے رہنے سے چمن میں دیدہ ور پیدا ہو جاتا ہے

بلکہ شاعر کے طریق استدلال کو سب سے الگ بتایا ہے۔ اس کے لیے مثال کا

مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ فرمائیے:

صد بار بہار آمد و گل تخت قرار دارد

خجل از کردۂ خود شرمسار گردد

یہ کلام نہایت شائستہ کا شعر ہے۔ ظاہر میں اس پر بے تکلف تخیل کا تقاضا ... کا

یہ استدلال خالص شاعرانہ ہے، یعنی شاعر کہتا ہے کہ انسان کی موت مرحلہ ختم نہیں

بلکہ موت کے بعد ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ وہ زندگی دراصل ہماری ایک خاص وضع کو

بسر کرنے کی متقاضی ہے۔ اگر اس وضع کی زندگی، جو بعض رسالہ بارہا ... کے مطابق

بسر کر سکنے کی، وجود ہماری کی موت ہمیشہ کی موت ہے تو یقیناً انسان کی تخلیق اور

کے لیے خاص وضع کی زندگی تجویز کرنا سراسر بے سود اور مہمل ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو

انداز میں پیش کیا گیا کہ انسان نتیجے پر پہنچ جاتا ہے ... اور ... وضع

کہ شاعر نے اپنے مضمون کی دل نشینی کے دل پذیر کے لیے نہایت اہم دلیل پیش کر دی

وہ استدلالی یا منطقی دلیل نہیں۔ شاعرانہ دلیل ہے اور شاعرانہ دلیل کا انداز و تقاضا

دوسرا ہوتا ہے۔ غور کیجیے، مصرعہ ثانی دراصل اس لیے خارجی ... گزشتہ ... بات

ہو نہیں سکتا۔ اس طرح انسان کی حرکت کو حرکت دوام ... بات

وہ حرکت دوام نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ... بات ہے ... شرمسار نہیں ہو سکتا۔

[illegible]

پیش لفظ

پیشِ نظر کتاب مولانا غلام رسول مہر مرحوم و مغفور کے اُن مقالات پر مشتمل ہے جو اُنھوں نے مختلف اوقات میں علّامہ اقبالؒ کے متعلق قلمبند کئے۔

اِن میں سے اکثر مقالات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے لیکن ان میں سے بیشتر نایاب نہ سہی کمیاب ضرور تھے۔ اور ہر فرد کے لیے ان نوادر تک رسائی ممکن نہ تھی۔ انھیں یکجا کرنے کا احساس مولانا مرحوم کو اپنی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اور انھوں نے مضامین کی فراہمی و ترتیب کا فریضہ صاحبزادہ یوسف طاہر صاحب کے سپرد کر دیا تھا جنھوں نے تلاش و ترتیب کا خاصا کام کر لیا تھا مگر مولانا موصوف کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کام تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

بعد ازاں راقم الحروف نے اِس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور خدا کی رحمت سے راقم کی مولانا مرحوم کے بعض غیر مطبوعہ نوادرات تک رسائی ہو گئی، نیز مولانا مرحوم کے متروکہ ذخیرہ میں سے علّامہ اقبالؒ کو اٹلی کی حکومت کا جاری کردہ ایک نایاب ریلوے پاس بھی دستیاب ہو گیا جسے شاملِ اشاعت

کیا جارہا ہے۔ یوں ایک ایسا مرقّع خوانندگانِ کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نگارشات پر مشتمل ہے ع

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

○

امجد سلیم علوی
خلفِ اصغر مولانا مہرؔ مرحوم
المہر۔ ۳ وحدت روڈ۔ لاہور

۹ نومبر ۱۹۸۷ء

علّامہ سے تعارف

میں حضرت علّامہ اقبال کے اسمِ گرامی سے پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں متعارف ہوا۔ اس زمانے میں حضرت مرحوم کو لوگ عموماً شیخ محمّد اقبال کہتے تھے اور کسی کو اندازہ نہ تھا کہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اقبال ان مراتب عالیہ پر پہنچنے والے ہیں، جو صرف ممتاز عالمی شخصیتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس وقت میں اپنی عُمر کے تیرہویں مرحلے میں تھا۔

میں مشن ہائی سکول جالندھر میں تعلیم پا رہا تھا۔ جالندھر اگرچہ بہت پرانا شہر تھا لیکن وہاں دوسرے شہروں کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاعات کم تر ہی پہنچتی تھیں۔ البتہ غلام پہلوان اور کیکر سنگھ پہلوان کی کشتیوں کے متعلق بہت سی کہانیاں سُنی جاتی تھیں۔ یہ عرض کرنا مُشکل ہے کہ وہ سب کی سب سچّی تھیں یا ان میں رنگ آمیزی بھی راہ پا گئی تھی۔

حضرت علّامہ مرحوم سے رسمی تعارف یُوں ہوا کہ مسلمانانِ جالندھر نے اپنی تعلیمی مساعی کا آغاز ایک اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس کے قیام سے کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مقامی سکولوں میں تعلیم پانے والے مسلمان نونہالوں کی تربیت اسلامی اُصول پر کی جائے۔ کسی سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں ایسا کوئی انتظام مُہیّا نہ تھا، اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

میں مشن ہائی سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ پھر اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو گیا، اس لیے کہ اس کا فاصلہ ہمارے سکول سے صرف ایک فرلانگ تھا، اور اتنا ہی فاصلہ اس زمانے کے گورنمنٹ ہائی سکول کی عمارت سے تھا۔ غالباً انہی دو بڑے سکولوں کے مسلم طلبہ کے لیے اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس قائم کیا گیا تھا اس کی عمارت دونوں سے قرب رکھنے کا راز بھی غالباً یہی تھا۔ وہاں منتقل ہونے کا ایک زائد محرک یہ ہوا کہ اس کے پہلے سپرنٹنڈنٹ میرے ایک رشتہ دار تھے۔

میں نے بورڈنگ ہاؤس میں پہنچا تو طلبہ کے علاوہ وہاں ایک ویکسی نیٹر بھی مقیم تھا، جس نے بورڈنگ ہاؤس میں قیام کی خاص اجازت لے لی تھی۔ اس کا وطن لاہور تھا۔ موسم سرما کا بڑا حصہ وہ اپنے رفیقوں کے ساتھ دیہات میں پھر پھر کر چیچک کے ٹیکے لگاتا، گرمیوں میں عموماً دفتری کام کرتا نام یاد تو نہیں لیکن ہم انہیں شاہ صاحب یا شاہ جی کہہ کر پکارتے تھے۔

ان کے پاس کچھ کتابیں اور کچھ رسالے تھے، ان میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاسوں کی کارروائیاں بھی تھیں، جن میں وہ تمام خطبے لیکچر اور نظمیں چھاپی جاتی تھیں، جو سالانہ اجلاس کی مختلف مجلسوں میں دیئے جاتے تھے، میں نیز دوسرے طلبہ یہ کارروائیاں اور رسالے شاہ جی سے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی بعض اجلاس کی کیفیت بھی سنایا کرتے تھے اور "شیخ محمد اقبال" کی بہت ستائش فرمایا کرتے تھے، کہتے تھے وہ بہت بڑے شاعر ہیں اور آج کل ولایت گئے ہوئے ہیں۔

میں نے ان کارروائیوں میں اقبال کی نظمیں خصوصیت سے پڑھیں لیکن تیرہ سال کے بچے کو جس کا علم فارسی اور اردو کی محض ابتدائی کتابوں تک محدود تھا ان نظموں کی بلند حیثیت کا کیا اندازہ ہو سکتا تھا؟ تاہم اقبال سے سمعی تعارف کی ابتدا اب تک لوح ذہن پر بالکل تازہ ہے۔

اسی زمانے میں ایک موقع پر شیخ عبدالقادر مرحوم، جو ولایت سے بیرسٹری کی سند لیکر تازہ تازہ آئے تھے، جالندھر تشریف لائے اور انہوں نے اسلامیہ بورڈنگ ہاؤس کو بھی اپنے قدوم سے مشرف فرمایا۔ طلبہ نے شاہ جی کی انہی کارروائیوں سے چودھری خوشی محمد مرحوم کی نظم کے چند اشعار لیے اور ایک آدھ شعر میں ترمیم کر کے اسے شیخ عبدالقادر مرحوم کے استقبال کے لیے موزوں بنا لیا حالانکہ وہ موزوں نہ تھی باایں ہمہ اسے اس شان سے پڑھا گیا وہ چودھری خوشی محمد مرحوم نے اسی تقریب کے لیے کہی تھی، جس کا انتظام ہم نے شیخ عبدالقادر مرحوم کے لیے کیا تھا۔ عہد طفلی کی نیرنگیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔

(۳)

میٹرک پاس کر کے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آیا تو اقبال کی ذاتِ گرامی کے متعلق نسبتاً زیادہ معلومات حاصل ہوئیں۔ یہاں بعض مجلسوں میں ان کی زیارت سے بھی قلب و نظر نے بقدرِ استطاعت کسبِ فیض کیا۔

اقبال کا کلام خود اقبال کی زبان سے پہلی مرتبہ انجمن حمایتِ اسلام کے اس سالانہ اجلاس میں سُنا جو ریواز ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہوا تھا۔ (سنہ ۱۹۱۱ء) ریواز ہوسٹل کے صحن میں ایک پختہ راستہ شرقاً غرباً اور دوسرا شمالاً جنوباً بنا ہوا تھا جس سے صحن چار مربعوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ داخلے کے پھاٹک کے دائیں جانب جو آخری مربع ہے اس میں سٹیج کا انتظام کیا گیا تھا۔ باقی صحن اور چاروں طرف کے برآمدوں نیز داخلے کی جانب کی دوسری منزل کے برآمدے اور چھتوں پر بھی حاضرین موجود تھے۔ اقبال نے اس اجلاس میں "شکوہ" پڑھا تھا۔ اس نظم کے کچھ حالات ہم اپنے استاذ مکرّم خواجہ دل محمّد مرحوم سے سُن چکے تھے۔ جو وقتاً فوقتاً حضرت علاّمہ اقبالؒ سے ملتے رہتے تھے۔ بلکہ انہوں نے اس نظم کے کچھ شعر بھی سنائے تھے۔ جن میں سے ایک یہ تھا۔ ؎

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِؓ حبشی رکھتے ہیں

اقبالؒ نے پہلے ایک قطعہ سُنایا، پھر شکوہ پڑھا۔ جن کاغذوں پر وہ اپنے قلم سے نظم لکھ کر لائے تھے وہ نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم رئیس مالیر کوٹلہ نے ایک سو روپے میں خرید کر انجمن کی نذر کر دیئے تھے اور سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک سو روپے آج کل کے دس ہزار کے برابر سمجھنے چاہئیں۔

اقبال سنہ ۱۹۰۵ء میں ولایت گئے تھے اور اس کے بعد پہلی مرتبہ انجمن کے اجلاس میں نظم سُنانے کے لیے آئے تھے۔ اس لیے مختلف سمتوں سے صدائیں بلند ہوئیں کہ معمول کے مطابق نظم گا کر پڑھی جائے۔ اقبال نے کہا کہ یہ نظم گا کر نہیں پڑھی جا سکتی۔ میں جس طرح پڑھتا ہوں آپ مہربانی فرما کر اسی طرح سُن لیں۔ علمی و ادبی صلاحیت کا پیمانہ اس زمانے میں بھی چنداں قابلِ ذکر نہ تھا۔

لیکن پورا شکوہ اقبال کی زبان سے سُنا تو دل کی عجیب کیفیت تھی، اور یہ احساس بھی پہلی مرتبہ ہوا کہ اقبال نے جس طرح نظم پڑھی اس کے پڑھنے کا احسن طریقہ وہی تھا۔ بلکہ اگر اسے تحت اللفظ نہ پڑھا جاتا اور آواز کے نشیب و فراز سے اس کے مختلف نکتے واضح نہ کیے جاتے تو نظم کی حقیقی حیثیت نمایاں نہ ہو سکتی۔

(۴)

لاہور پہنچ کر سخن شناسی اور سخن فہمی کا ذوق خاصا فروغ پذیر معلوم ہوتا تھا، لیکن اقبال کے ساتھ براہِ راست شناسائی پیدا کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اگرچہ سنتا رہتا تھا کہ وہ بے حد شفیق ہیں، جو بھی ان کی خدمت میں پہنچ جائے، اس سے بے تکلّف باتیں کرتے ہیں، لیکن ان کی عظمت کا تصوّر دل و دماغ پر اس طرح چھایا ہوا تھا، کہ ان کے قریب پہنچتے ہی ہمت جواب دے دیتی تھی، بعض اوقات اتفاقیہ ان سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی، مگر اس طرح کہ چار چھ بزرگ اور چند طالب علم بلا قصد و ارادہ ایک مجلس میں جمع ہو گئے اور دوسرے سے رسمی تعارف کے بغیر باتیں کرتے رہے۔

مثلاً ایک مرتبہ ہم چار پانچ طالب علم مولانا ظفر علی خاں مرحوم سے ملنے کے لیے نکلے وہ اس زمانے میں شاہ محمد غوثؒ کے پاس ایک نو تعمیر عمارت میں رہتے تھے جس کی دوسری اور تیسری منزل انہوں نے کرایے پر لے رکھی تھی، ہم دوسری منزل میں پہنچے تو مکان کے صحن میں مولانا ظفر علی خاں بیٹھے تھے مغرب کی نماز ہو چکی تھی، عشا کی اذان ابھی نہیں ہوئی تھی، مولانا سے تھوڑے فاصلے پر اقبال بھی تشریف فرما تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ اقبال نے شلوار پہن رکھی تھی، سفید قمیص اوپر چھوٹا کوٹ، سر پر لنگی بندھی تھی، ہاتھ میں چھڑی تھی اس زمانے میں وہ انارکلی لاہور میں رہتے تھے، میرا خیال ہے کہ شام کے وقت ٹہلتے ٹہلتے مولانا ظفر علی خاں سے ملنے کے لیے آ گئے تھے۔

ہمارے سامنے انہوں نے جو کچھ فرمایا اس کا مفاد یہ تھا کہ ظفر علی خاں آپ کے

اخبار میں کان پور کے فلاں صاحب (ایک شاعر کا نام لیا جسے میں حذف کر رہا ہوں) کی جو لمبی لمبی نظمیں چھپتی ہیں، بعض اوقات خیال آتا ہے کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لوں اور کانپور پہنچ کر ان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں، پھر سوچتا ہوں کہ اس شخص کو ختم کرنے کے لیے کان پور تک تھرڈ کلاس کا کرایہ خرچ کرنا بھی روپے کا ضیاع ہوگا۔

قطعاً شبہ نہیں کہ اس شاعر کی نظمیں بہت معمولی ہوتی تھیں اور عموماً "زمیندار" کا پورا پہلا صفحہ گھیر لیتی تھیں۔ حضرت علامہ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ اس قسم کی نظمیں اخبار میں نہ چھپنی چاہئیں۔ لیکن اس زمانے میں خبریں اور مضمون زیادہ نہیں ہوتے تھے اور اخبار نویس کا اوّلین مقصد یہ ہوتا تھا کہ اخبار کے صفحات جلد سے جلد پُر ہو جائیں۔

(۵)

دوسرے سال (سنہ ۱۹۱۲ء میں) انجمن حمایتِ اسلام کا سالانہ جلسہ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں ہوا۔ اس زمانے میں برانڈرتھ روڈ کے ساتھ کوئی عمارت نہ تھی۔ احمدیہ بلڈنگس سامنے نظر آتی تھی اور وہاں کے نوجوان بھی کھیلنے کے لیے اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں آ جاتے تھے۔ عام جلسے بھی عموماً اسی گراؤنڈ میں ہوتے تھے۔ دو چار سو آدمی گھاس پر آ کر بیٹھ جاتے تھے اور تقریریں کرنے والوں کو جو کچھ سُنانا ہوتا تھا سنا دیتے تھے۔ جس طرف مُبارک مسجد ہے، اس طرف دو عمارتیں تھیں۔ ایک کالج کی لائبریری اور دوسری کالج کے جیمنیزیم کی عمارت گراؤنڈ خاصی کھُلی تھی حبیبیہ ہال کے ساتھ سٹیج کا انتظام کیا گیا تھا۔ آگے خاصی دُور تک قناتیں اور شامیانے لگے تھے۔ مختلف اطراف میں دُکانیں بھی تھیں اور لوگ حسبِ ضرورت ٹہل بھی لیتے تھے۔ برانڈرتھ روڈ کی طرف سے جلسہ گاہ کے اندر آنے کا دروازہ اس گوشے میں تھا جہاں برانڈرتھ روڈ سے اُترتے تھے اور اس طرف اب انجمن کے دفاتر ہیں اس گوشے سے سٹیج تک راستہ بنا دیا گیا تھا۔ حضرت علامہ اقبال نظم پڑھنے کے لیے اسی راستے سے آئے تھے۔ سفید شلوار، سفید قمیص، سیاہی مائل گرم کوٹ اور سر پر ہارڈ ترکی ٹوپی تھی۔

اس کے بعد بھی انجمن نے دو تین سالانہ اجلاس اسی مقام پر منعقد کئے مگر جیسا عالی شان اجلاس ۱۹۱۲ء کا تھا ویسے بہت کم اجلاس ہوئے ہوں گے۔

اس سال حضرت علامہ نے شمع اور شاعر پڑھی تھی اس میں بعض واضح پیشگوئیاں ہیں۔ جو خدا کے فضل سے پوری ہو چکی ہیں۔ لیکن ۱۹۱۲ء میں میرے علم کی حد تک کسی کو احساس بھی نہ تھا یہ نظم پیشگوئیوں پر مشتمل ہے۔ خود میری حالت بھی عام اصحاب سے مختلف نہ تھی۔ حضرت علامہ کی نظم کے سلسلے میں ایک جھگڑا رونما ہوا۔ انجمن کے اجلاسوں کی صدارت کے لیے وہ اصحاب تجویز کئے جاتے تھے جن کے ذریعے زیادہ سے زیادہ رقم فراہم ہو سکے۔ اتفاقیہ اس سال دو ایسے اصحاب تھے جن کے ذریعے بڑی رقم وصول ہونے کا امکان تھا اور وہ دونوں اصرار کر رہے تھے کہ اقبال کی نظم ان کی صدارت میں ہو۔ آخر اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ ان دونوں کی صدارتیں یکے بعد دیگرے ہوں "شمع اور شاعر" کے پہلے چھ بند ایک صدر کے اجلاس میں پڑھے جائیں، پھر علامہ کو کچھ وقت سستانے کے لیے مل جائے اور باقی چھ بند دوسرے کی صدارت میں پڑھے جائیں۔ اسی لیے اقبالؒ نے ابتدا میں یہ قطعہ پڑھا تھا

هم‌نشینِ بے ریایم از رہِ اخلاص گفت
کاے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر

درمیانِ انجمن معشوقِ ہر جائی مباش
گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر

گفتمش اے ہم‌نشیں معذور میدارم ترا
در طلسم امتیازِ ظاہری ہستی اسیر

من کہ شمعِ عشق در بزمِ جہاں افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم

اس میں سلطان سے مراد مرزا سلطان احمد تھے جو پہلے اجلاس کے صدر تھے۔ اور فقیر سے مراد فقیر افتخار الدین تھے جو لاہور کے ایک ممتاز خاندان کے رکن اور اس دور کے ممتاز عہدیدار تھے۔

(۶)

"شمع اور شاعر" مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اپنے پریس میں چھپوا دی تھی۔ دس ہزار کاپیاں چھاپی گئی تھیں اور ہر کاپی کی قیمت خلافِ معمول آٹھ آنے رکھی گئی تھی۔ مولانا

ظفر علی خاں نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ اس طرح نظم کی کاپیاں بک جانے سے پانچ ہزار روپے وصول ہوں گے اور یہ رقم ڈاکٹر اقبال کے حوالے کر کے ان سے کہہ دیا جائے گا کہ تبلیغِ اسلام کے لیے جاپان چلے جائیں۔

یہ نظم بھی پوری کی پوری میں نے اقبال کی زبانِ مبارک سے سُنی۔ اس کے بعد میری طالب علمی کے زمانے میں دو اجلاس اور ہوئے۔ ایک میں متفرق قطعات کے علاوہ وہ مزاحی قطعے پڑھے گئے جن کا نام خود حضرت علامہ نے رگڑا تجویز کیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ اکبری اقبال کے نام سے معروف ہوئے کیونکہ ان میں مزاح کا رنگ غالب تھا۔ دوسرے اجلاس میں پہلے تقریر فرمائی۔ پھر وہ نظم سُنائی جس کا مطلع ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

مجھے اب تک یاد ہے کہ حضرت علامہ مرحوم نے منتظر کے ظ کے مفتوح ہونے پر خاص زور دیا ہے اور فرمایا تھا اسے منتظِر نہیں منتظَر پڑھا جائے یعنی وہ حقیقت جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ آخر میں مثنوی "اسرارِ خودی" کے تمہیدی مطالب میں سے پندرہ بیس اشعار پڑھے اس وقت تک یہ مثنوی غالباً مکمل نہیں ہوئی تھی۔

(۷)

میں مئی ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے کا امتحان دے کر لاہور سے چلا گیا اور ساڑھے چھ سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں اخبار نویسی کے لیے آیا۔ اس وقت ملک کے حالات میں بنیادی تبدیلی آ چکی تھی۔ ترکِ موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ میں "زمیندار" سے وابستہ ہو گیا تھا۔ لیکن والدہ نے اجازت نہ دی اور میں نے دفتر زمیندار میں معذرت لکھ بھیجی۔ اتفاق سے اخبار ضبطی ضمانت کے باعث کچھ عرصے کے لیے بند ہو گیا جب اس کے از سرِ نو اجرا کا انتظام ہوا تو شفاعت اللہ خاں مرحوم جو اس زمانے میں "زمیندار" کے مہتمم عمومی تھے، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش مرحوم

کے ساتھ میرے گاؤں پہنچے جو جالندھر شہر سے پانچ میل جانب جنوب تھا۔ میری والدہ کو یقین دلا دیا کہ مہر کو رسمی طور پر اخبار سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اسے بالکل الگ رکھا جائے گا۔ یوں میرے لیے اوائل فروری ۱۹۲۲ء میں مستقل طور پر لاہور آنے اور اخبار سے وابستہ ہو جانے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں حضرت علامہ مرحوم انارکلی بازار کی ایک وسیع عمارت کے بالائی حصے میں رہتے تھے۔

(۸)

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ چودھری محمد حسین مرحوم کالج کے زمانے میں میرے نہایت عزیز دوستوں میں سے تھے۔ وہ تعلیم مکمل کر چکے تو نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم نے چودھری صاحب کو اپنا سیکرٹری بنا لیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں چودھری صاحب نے اپنی غیر معمولی دوراندیشی، اصابتِ رائے اور خلوص و دیانت کی برکت سے ایسی حیثیت حاصل کر لی تھی کہ نواب صاحب مرحوم کے ہاں ایک معزز رکنِ خاندان کے درجے پر فائز ہو گئے اور نواب صاحب کوئی کام چودھری صاحب سے مشورہ کیے بغیر نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں حضرت علامہ مرحوم قریباً روزانہ نواب صاحب کے ہاں جاتے تھے، اس طرح حضرت علامہ اور چودھری صاحب کے درمیان بھی گہرے روابط پیدا ہو گئے۔ میں دوسرے اصحاب کے علاوہ چودھری صاحب مرحوم سے بھی وقتاً فوقتاً ملتا رہتا تھا۔

ایک روز شام کے وقت میں شفاعت اللہ خاں مرحوم اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش مرحوم گول باغ میں سیر کر رہے تھے لوہاری دروازے اور شاہ عالمی دروازے کے درمیان اتفاقیہ چوہدری محمد حسین مل گئے۔ شفاعت اللہ خاں مرحوم نے اچانک چوہدری محمد حسین مرحوم سے فرمائش کر دی کہ حضرت علامہ کی کوئی ایسی نظم سنائیے جو اب تک کہیں چھپی نہ ہو۔ چوہدری صاحب نے مندرجہ ذیل چار شعر سنائے:

یوں موج پریشان خاطر نے پیغام لب ساحل کو دیا
ہے دُور وصالِ بحر ابھی تو دریا میں گھبرا بھی گئی
عزّت ہے مُحبّت کی قائم اے قیس حجاب محمل سے
محمل جو گیا عزّت بھی گئی غیرت بھی گئی لیلیٰ بھی گئی
کی ترک تگ و دو قطرے نے تو آبرو نے گوہر بھی گئی
آوارگیٔ فطرت بھی گئی اور کشمکش دریا بھی گئی
نکلی تو لبِ اقبالؔ سے تھی، کیا جانیے کس کی تھی یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

اس کا پہلا شعر یعنی :

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمّت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

یا تو اس وقت چودھری صاحب کو یاد نہ آیا یا انہوں نے سُنانا ضروری نہ سمجھا۔ موچی دروازے سے آگے بڑھے تو چودھری صاحب چلے گئے۔ ہم دفتر زمیندار میں پہنچ گئے جو دہلی دروازے کے باہر اس وسیع عمارت کے بالائی حصّے میں تھا۔ جسے "جہازی بلڈنگ" کہتے تھے۔ ہم یعنی میں اور میکش مرحُوم دفتر ہی میں رہتے تھے۔ راستے میں بھی چودھری صاحب کے سنائے ہوئے شعر ہماری گفتگو کا موضوع بنے رہے اور میں گفتگو کے دوران میں بعض شعر پڑھتا بھی رہا۔

(۹)

دفتر میں پہنچ کر شفاعت اللہ خاں مرحُوم نے کہا کہ جو شعر سُن کر آئے ہو ایک کاغذ پر لکھ دو یہ اللہ تعالےٰ کا فضل تھا۔ کہ اچھے شعر ایک مرتبہ بھی دلجمعی سے سُن لیتا تو ذہن میں بدستور تازہ رہتے تھے۔ میں نے حافظے پر زور ڈال کر چاروں شعر اسی ترتیب سے لکھ دیئے جس ترتیب سے سُنے تھے اور اگلے روز وہ زمیندار میں چھپ گئے مجھے معلوم نہ تھا کہ بلا اجازت شعر چھاپنا نامناسب ہے۔ دوسرے

روز دوپہر کے وقت چوہدری محمد حسین مرحوم دفتر زمیندار میں آئے اور مجھ سے پوچھا تم نے یہ شعر کہاں سے لیے؟ میں نے کہا کہ آپ ہی نے تو کل شام کو سنائے تھے۔ شفاعت اللہ خاں کے اصرار پر میں نے لکھ دیئے۔ چودھری صاحب نے فرمایا، چلو میرے ساتھ۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا، اور ہم حضرت علامہ مرحوم کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ وہ اس وقت انارکلی میں رہتے تھے، جہاں وہ ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء سے مقیم تھے۔

میں اس مکان میں پہلی مرتبہ گیا تھا۔ میں خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ اس لیے کہ آشکار ہو گیا تھا۔ اس حاضری کی حیثیت ایک لحاظ سے پیشی کی ہے، سیڑھیاں چڑھ کر ہم جس کمرے میں پہنچے تھے، حضرت علامہ وہاں ایک کرسی پر تشریف فرما تھے سیڑھیوں کے قریب جو کرسی تھی اس پر مجھے بٹھا دیا گیا۔ چودھری صاحب میرے بائیں جانب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر حضرت علامہ مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا: مجرم کو پکڑ لایا ہوں۔ یہ سن کر حضرت علامہ نے مجھ سے پوچھا آپ نے یہ شعر کہاں سے لیے؟ میں نے پورا واقعہ من وعن بیان کر دیا۔ یعنی کل شام کے وقت اتفاقیہ چوہدری صاحب گول باغ میں مل گئے تھے۔ شفاعت اللہ خاں نے ایسے شعر سننے کی فرمائش کی جو کہیں چھپے نہ ہوں۔ چودھری صاحب نے چار شعر سنا دیئے۔ ہم دفتر میں پہنچے تو شفاعت اللہ خاں نے کہا کہ جو شعر ابھی سنے ہیں انھیں کاغذ پر لکھ دو۔ میں نے لکھ دیئے۔ اس کے سوا میرا کوئی قصور نہیں۔

یہ سن کر حضرت علامہ مرحوم نے فرمایا۔ آپ سچ کہتے ہیں؟ اس وقت مجھے احساس ہوا۔ کہ غالباً حضرت علامہ کو میری گزارش کا یقین نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ واقعہ تو یہی ہے۔ میں اچھا شعر سن لیتا ہوں تو مجھے عموماً نہیں بھولتا۔ میں اور تو کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ آپ چاہیں تو اور شعر سنا کر میرا امتحان لے لیں۔

یہ جواب سن کر حضرت علامہ کے چہرۂ مبارک پر تبسم کی ہلکی ہلکی لہریں نمودار ہو گئیں اور صرف یہ فرمایا۔ یہ حافظہ تو بڑا خطرناک ہے۔

مؤتمرِ عالمِ اسلامی کی کانفرنس منعقدہ بیت المقدس (دسمبر ۱۹۳۱ء) میں
علامہ اقبالؒ اور ان کے برابر میں بیٹھے ہوئے مولانا مہرؔ

یہ حضرت علامہ مرحوم سے پہلا براہِ راست تعارف تھا۔ اس مکان میں پھر ایک مرتبہ سالک مرحوم کے ساتھ گیا تھا، اس وقت حضرت علامہ مرحوم نے ایک بڑا رجسٹر لے کر پیامِ مشرق کی بعض نظمیں سنائی تھیں لیکن ان میں سے مجھے اب کچھ یاد نہیں، صرف یہ یاد ہے کہ رجسٹر حضرت علامہ کے ہاتھ میں تھا اور نظمیں سناتے وقت انھوں نے عینک لگائی تھی۔

(۱۰)

جلد ہی وہ انارکلی والے مکان سے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ (دسمبر ۱۹۲۳ء) میں فلیمنگ روڈ اور بیڈن روڈ (جسے دل محمد روڈ بھی کہتے تھے۔) کے چوک سے قریب ایک مکان میں رہتا تھا۔ چوک کے پاس ہی ایک بلڈنگ تھی جس کے نیچے دکانیں اور اوپر ایک ہی وضع کے پانچ فلیٹ تھے۔ یہ میرے قیام کے زمانے میں دل محمد بلڈنگ کہلاتی تھی، شاید اس لیے کہ ایک مرتبہ خواجہ دل محمد مرحوم نے خرید لی تھی، پھر فروخت کر ڈالی تھی۔ میں چوک کی طرف سے دوسرے اور میوہ منڈی کی طرف سے چوتھے فلیٹ میں رہتا تھا۔

یہ مکان حضرت علامہ مرحوم کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے بہت قریب تھا۔ شاہ ابوالمعالیؒ کے پاس جو بلند عمارتیں بن گئی ہیں ناپید تھیں اور ایک نیا بازار دل محمد روڈ سے میکلوڈ روڈ تک نکل آیا ہے مفقود تھا شاہ ابوالمعالیؒ کے پاس میکلوڈ روڈ پر ایک میدان سا تھا جس میں دھوبی دن کے وقت کپڑے سکھایا کرتے تھے، شام کے وقت میدان خالی ہو جاتا تھا۔ میں اپنے مکان سے نکلتا تو شاہ ابوالمعالی کے پاس کے میدان سے گزرتا ہوا پانچ سات منٹ میں حضرت علامہ مرحوم کی کوٹھی پہنچ جاتا تھا۔ چودھری محمد حسین مرحوم نے قلعہ گوجر سنگھ میں مکان کرایے پر لے لیا تھا جو بعد میں انھوں نے خرید کر از سرِ نو بنوا لیا تھا، وہ بھی آجاتے تھے۔ اس طرح روزانہ قریباً دو دو تین تین گھنٹے کی نشست ہو جاتی تھی، حضرت علامہ مرحوم گفتگو فرماتے، چودھری صاحب اس میں کبھی کبھی دخل دیتے، میں چپ چاپ یہ گفتگو سنتا رہتا، مجھ سے کچھ پوچھا جاتا تو جواب دیتا۔ پھر میں بیڈن روڈ (یا دل محمد روڈ) پر "رمضان بلڈنگ" کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا، جس کے نیچے بعد میں شفاء الملک

حکیم محمد حسن قرشی نے قومی دواخانہ قائم کیا، گویا حضرت علامہ کی قیامگاہ سے اور بھی قریب ہوگیا۔ حضرت علامہ از راہِ شفقت کبھی کبھی چودھری علی بخش مرحوم کو بھیج کر خود بلا لیتے تھے۔

(۱۱)

یہ قربِ مسلسل کئی سال تک جاری رہا اور حضرت علامہ کی بابرکت صحبت سے استفادے کا موسمِ بہار یہی تھا۔ میں نے اس دور میں دو تین مرتبہ التزام کیا کہ روزانہ گفتگوؤں کا خلاصہ روزنامچے کے طور پر لکھتا رہوں۔ اسی زمانے میں زبورِ عجم کا آغاز ہوا تھا اور حضرت علامہ مرحوم عموماً زبور کے تازہ اشعار تنہائی میں مجھے اور چودھری صاحب کو سنایا کرتے تھے۔ میں گھر پہنچتا تو حافظے پر زور دے کر سنے ہوئے اشعار لکھ لیتا، جو یاد نہ رہتے ان کی جگہ نقطے لگا لیتا۔ یہ کاپی بھی اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ ہر کلام پر تاریخ درج ہے وہ لازماً اسی روز یا دو ایک روز پیشتر لکھا گیا۔ نیز بعض اشعار کے متعلق حضرت جو کچھ فرماتے وہ بھی نوٹ کر لیتا۔ اب دیکھتا ہوں تو ان ارشادات سے بعض نظموں کا مفہوم متعین کرنے میں آسانی محسوس ہوئی اور اس طرح اشعار کے مطالب زیادہ واضح ہو گئے۔ یہ سب کچھ اس روزنامچے میں درج کر دیا گیا ہے، جس کی تمہید کے طور پر یہ داستان مرتب کر رہا ہوں۔

مغرب کے بعد سے دس گیارہ بجے تک یہ صحبت برابر قائم رہتی لیکن کلام سنانے کا سلسلہ اس وقت شروع ہوتا جب دوسرے لوگ رخصت ہو جاتے۔ میں نمازِ مغرب سے کچھ عرض لعلم اجازت مانگتا تو فرماتے کہ ٹھہرو، کچھ کام ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا کہ کلام سنائیں گے۔

ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ حضرت پلنگ پر تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے کہ اشعار سناتے سناتے بجلی بند ہو گئی۔ حضرت بھی خاموش ہو گئے اور ہم بھی خاموش بیٹھے رہے۔ پانچ دس منٹ بعد بجلی از سرِ نو روشن ہوئی تو معلوم ہوا کہ حضرت کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ میرے لیے یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ جو شعر سنا رہے تھے ان میں خطاب رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا۔

ایک مرتبہ بجلی کی روشنی ذرا کم تھی اور ہم میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ حضرت

اشعار کا رجسٹر لے کر بجلی کے عین نیچے جا کھڑے ہوئے اور اسی عالم میں کلام سے مشرّف فرماتے رہے۔

ایک مرتبہ مجھے فراغت تھی اور صبح ہی خدمت والا میں پہنچ گیا، پھر میں اور حضرت علاّمہ مسلسل گیارہ گھنٹے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، جن اصحاب نے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی دیکھی ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ اس کا برآمدہ خاصا وسیع تھا، اس برآمدے میں کرسیاں توادھر ادھر ضرور کھسکاتے رہے لیکن اُٹھے نہیں کھانا بھی وہیں کھایا، اور اتفاق یہ کہ اور کوئی شخص آیا ہی نہیں جس سے صحبت اور گفتگو میں خلل پڑتا، حالانکہ ان کے ہاں لوگ بکثرت آتے رہتے تھے۔

میں اس زمانے میں حُقّہ بہت پیتا تھا، حقّہ نہ ملتا تو سگرٹ شروع کر دیتا، علاّمہ مرحوم کے حقّے میں شریک ہو جانے کو خلافِ ادب سمجھتا تھا، اس وجہ سے میرے حاضر ہوتے ہی علی بخش کو دوسرا حُقّہ لے آنے کا حکم دے دیتے، پھر علوم و حکم اور حقائق و معارف کا بحرِ زخّار جوش میں آجاتا، عُرفی نے جہانگیر کے قصیدے میں کہا تھا۔

لبش جو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت
فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

مجھے کم از کم سولہ سال تک اس شعر کا عملی تجربہ وسیع پیمانے پر ہوتا رہا، دس سال تک روزانہ اس طرح کئی کئی گھنٹے آبِ حیات کے جام پے در پے سامعہ کے ذریعے چڑھاتا رہا، جب میں مسلم ٹاؤن میں منتقل ہو گیا (۱۴ دسمبر ۱۹۳۲ء) تو بُعدِ مکانی کے باعث استفادے کی پہلی حالت یقیناً قائم نہ رہی، تاہم میں دوسرے تیسرے روز وقت نکال کر ضرور حاضر ہو جاتا، یہاں تک کہ حاضری کا یہ سلسلہ اس وقت بھی بدستور جاری رہا جب وہ جاوید منزل میں منتقل ہو گئے اور میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے میرے لیے جاوید منزل اور بھی دُور ہو گئی تھی۔

(۱۲)

میں حضرت علاّمہ مرحوم کے متعلق جو کچھ مختلف اصحاب سے سُنتا رہتا تھا وہ بظاہر خصوصی

عقیدت پیدا کرنے کے لیے چنداں سازگار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مجھ عاجز وہیچ مداں کو بساطِ قُرب کے تازہ واردوں میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تو اس وقت مذہبی نقطۂ نگاہ سے میری عام حالت وہی تھی جو مرزا غالب کے قرب میں پہنچنے کے وقت خواجہ حالی مغفور کی تھی۔ خواجہ حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں :

"یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے، خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں سے اہلِ سُنّت کو . . .

. . . . . اور ان میں سے بھی صرف ان لوگوں کو کہ صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقیّد کے ساتھ پابند ہوں، نجات و مغفرت کے لائق جانتے تھے ——"

چند روز حضرت کی خدمت میں گزار کر اندازہ ہوا کہ دینِ حق کیا ہے اور اس کا مقصود کیا ہے۔ اب احوالِ ماضی پر نظرِ بازگشت ڈالتے ہوئے زندگی کے اس حصّے پر پہنچتا ہوں تو اپنی نادانی، نافہمی اور ناکسی پر تعجب ہوتا ہے۔ علم محدود، نظر کوتاہ، دماغ ناپختہ، جس متاع کو سرمایۂ افتخار و امتیاز سمجھ رہا تھا، وہ اس درجہ کاسہ ثابت ہوئی کہ اس کا وجود و عدم برابر معلوم ہونے لگا۔ اگر میں کہوں کہ ازسرِ نو حلقۂ اسلام میں داخل ہوا تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے۔ پہلا اسلام حقیقۃً رسمی تھا۔ حقیقی اسلام یا رُوحِ اسلام کی چاشنی سے اب ابتدائی لذّت اندوزی کی نوبت آئی۔ یہ سچ ہے منازلِ ارتقا میں انسان پر ہر قسم کے دور آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ایسا انتظام فرما دیا کہ وہی متاعِ کاسد اور مسِ خام اکسیر کے قریب پہنچی تو فطری صلاحیت کے مطابق کسبِ فیض کر کے ایسی ضرور بن گئی کہ کم از کم اپنے تصوّر کے مطابق باعثِ ننگ نہ رہی۔ اسی وقت یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ اب تک ان کی ذاتِ گرامی کے ساتھ جو عقیدت تھی وہ ان کے شاعرانہ کمالات کے لیے محض دماغی اور ذہنی خراج تھی۔ اور اس کی حیثیت ایسی شراب کی تھی جو کیف سے یکسر تہی دامن ہو۔ اب قلب و رُوح کی شہادت نے اس عقیدت میں ایک کیفیت پیدا کر دی۔

جسے الفاظ کا لباس پہنانا میرے لیے ممکن نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے علمِ دین کے اثرات صرف ذہن و دماغ تک محدود تھے اب ان کا سرچشمہ قلب و روح پر طاری ہو گیا۔ اسی دور میں اندازہ ہوا کہ محض کتابیں دیکھ لینا کافی نہیں، ضروری ہے کہ کسی صاحبِ کمال کی صحبت میں اس علم کو جاندار بنایا جائے۔

حضرت کا سرچشمۂ فیضان ہر لحظہ جوشاں رہتا تھا اور ان کے لبوں پر جو بات آتی تھی، جواہر پاروں سے زیادہ بیش بہا تھی، تاہم استفادے کا معاملہ اپنی صلاحیت پر موقوف تھا:

ہر رشحہ بہ اندازہ ہر حوصلہ دارند
مے خانۂ توفیق خم و جام نہ دارد

اپنی ہمت کی کوتاہی صلاحیت کی فرومایگی اور قوتِ جذب و ہضم کی سطحیت پر کتنی ہی حسرت اور کتنا ہی افسوس ہو، تاہم اس ابرِ گوہر بار کی بے نہایت بخششوں سے تنگ بخشی کے شکوے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ حضرت علامہ کی ذاتِ گرامی ہر فرد کے لیے مرزا غالب کے اس شعر کا ایک بدیع عملی پیکر تھی:

وسعت سعی کرم دیکھ کہ سر تا بسر خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز

اگر پیمانۂ طلب بہ قدرِ شوقِ آرزو سرشار نہ ہو سکا تو اس کے لیے صرف اپنی واماندگیوں اور نارسائیوں کو ذمہ دار ٹھہرانا چاہیے ساقی کا لطف و کرم تو اولیں لمحہ سے آخر تک یکساں دلنواز اور روح پرور رہا۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

معاملے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جب تک دولتِ مطلوب ہاتھ نہیں آتی، اس کی طلب چند لمحوں کے لیے بھی چین نہیں لینے دیتی اور جی چاہتا ہے کہ جو لمحہ بھی نصیب ہو اس

دولت سے بے تامل جیب و دامن بھر لینے چاہئیں۔ جب دولت دسترس میں آجائے تو اک گونہ غفلت کا پردہ دل پر چھا جاتا ہے، یا سمجھ لیجے کہ آسودگی سی پیدا ہو جاتی ہے کہ جب چاہیں گے، اس سے خواہش کے مطابق استفادہ کر لیں گے۔ اس کے چھن جانے کا اندیشہ دل سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تو یہ انسانی نفسیات کا ایک خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے، تو اسے ہمیشہ کے لیے اپنی سمجھ لیتا ہے اور حادثاتِ روزگار کا بھی اسے کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ اسی غفلت کی بجلیوں نے مجھ سیاہ بخت کا خرمنِ آرزو بھی پھونک ڈالا۔ جب تک بساطِ قرب میں نہیں پہنچا تھا، آرزو تھی کہ یہ پوچھیں گے وہ پوچھیں گے ..... ۔

تو سب کچھ بھول گئے اور محض حضرت کے لطف و کرم کو مجلسِ قرب کی غرض و غایت سمجھ لیا، یعنی بقولِ نظیری :

محرومِ فقر و توکل دراز دستیِ نیست
نشستہ ایم کہ خرما در افتد زنخیل؟

یعنی ہم خود خرما حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں گے، جو کچھ نخل سے گرتا جائے گا۔ اسی پر قناعت کیے بیٹھے رہیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جن آرزوؤں سے بساطِ قرب میں پہنچا وہ بقدر ایک فی صد بھی پوری نہ ہوئیں، یہاں تک کہ جو کچھ ہونے والا تھا، اس طرح ہو گیا، گویا جو کچھ ہم دیکھ رہے تھے وہ حقیقت نہ تھی محض ایک خواب تھا۔

حضرت کے آخری دنوں میں بھی بارہا حاضر ہوا اور گھنٹوں بیٹھا رہا۔ اس زمانے میں کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی، بار بار یہ خیال دامن گیر ہو جاتا کہ مبادا حضرت سمجھیں، یہ خلافِ عادت سوالات اس لیے کئے جا رہے ہیں کہ میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ نیز انہیں دوسروں سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتے تو وسوسہ بھی نہ ہوتا کہ ہم جلد اس نورانی چہرے سے محروم ہو جائیں گے۔ انتقال سے صرف دو روز پیشتر میں اور سالک مرحوم حاضر ہوئے۔ حضرت ایک جرمن عالم[1]

---

[1] بیرن فان فلیٹ ۔ جرمنی میں حضرت علامہ مرحوم کے ہم جماعت ۔

سے باتیں کر رہے تھے، ہم معمول کے مطابق چُپ چاپ، ایک طرف بیٹھ گئے۔ ان کی اور جرمن عالم کی باتیں سُنتے رہے، جرمن عالم کبھی کبھار دو چار لفظ بولتا اور حضرت بے تکلفی سے قریباً مسلسل باتیں کر رہے تھے اس وقت کی گفتگو اور تندرستی کے زمانے کی گفتگو میں قطعاً کوئی فرق نہ تھا۔ ممکن ہے شفاؔ الملک حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم جیسا حاذق کوئی فرق بہتر طریق پر محسوس کر لیتا جنہوں نے کراچی کے ریڈیو سے مولانا سید سلیمان کی تقریر ڈھاکے میں سُن کر لکھا تھا کہ آپ کی آواز ضعفِ قلب کا اعلان کر رہی ہے، اس کا کوئی تدارک کر لیجیے۔

جرمن عالم رُخصت ہو گیا تو حضرت کے ارشادات کا جواب ہم زیادہ سے زیادہ مختصر الفاظ میں دیتے رہے اس لیے کہ احساس یہ تھا حضرت کسی قدر تھک گئے ہیں، چنانچہ ہمارے بیٹھے بیٹھے علی بخش پیغام لایا "ماسٹر صاحب" (ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو ان کی ابتدائی مشغولیت کی بنا پر حضرت علامہ ماسٹر جی ہی کہتے تھے) اپنے چند دوستوں کے ساتھ سلام کے لیے حاضر ہوئے ہیں، علی بخش کے ہاتھ میں لپٹے ہوئے کاغذ بھی تھے، جو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اسے دیئے تھے دراصل ڈاکٹر عبداللہ ولایت میں رہ کر تاج محل پر اپنی کتاب مرتّب کر کے لائے تھے اور نقشے بھی اسی کتاب کے تھے تھکاوٹ ہی کے باعث حضرت نے فرمایا کہ انہیں سلام پہنچا دیجیے، بڑی خوشی ہوئی کہ وہ آ گئے پھر کسی وقت ان سے باتیں ہوں گی یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ وہ اس وقت کسی مزید ملاقات کی زحمت برداشت نہیں کر سکتے، ہم نے بھی اجازت چاہی یہ سب کچھ دیکھ چکے تھے لیکن دل اس حالت میں یہ یقین کر لینے پر آمادہ نہ تھا، کہ مفارقت کی ساعت اتنی قریب آ گئی ہے۔

مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ رات گزری، دن گزرا، دوسری رات کا بیشتر حصہ انتہائی تکلیف میں گزار کر ہماری اُمیدوں، آرزوؤں اور مسرّتوں کا آفتاب جہانتاب طلوعِ آفتاب کے قریب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربّك ذوالجلال والاکرام۔

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی آخری دور میں ان کے معالج اور طبی مشیر رہے، وہ فرماتے تھے کہ قلب ضعیف ہو گیا ہے، نبض دقیق وضعیف ہے، دل کسی قدر پھیل گیا ہے اور جگر بھی بڑھ گیا ہے، پاؤں پر ورم آگیا تھا، بائیں شانے پر درد ہوتا تھا، آخری روز ان کے تھوک میں خون آنے لگا تھا جو اس امر کی علامت تھا کہ دل کی طرف جانے والی رگ میں جو رسولی ہے، وہ پھٹ گئی ہے، یہ علامت بھی خاصی خطرناک تھی۔

وفات سے خاصی دیر پہلے انہوں نے خود بھی دل کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ آپ اس کی خوب دیکھ بھال کریں، اور رضی دانش کا یہ شعر بہ تصرف قلیل پڑھا تھا۔

تہنیت گوئید مستاں راکہ سنگِ محتسب
بر دِل ما آمد و ایں آفت از مینا گزشت

رضی دانش نے غالباً دوسرے مصرعے میں دل کی جگہ سر لکھا ہے لیکن حضرت نے شعر یونہی پڑھا اور میرے نزدیک اس تصرف سے شعر کا رتبہ بدرجہا بلند تر ہو گیا۔

آخری بیماری کے ابتدائی آثار ۱۹۳۳ء ہی میں شروع ہو گئے تھے، اگرچہ اس وقت کسی کو اندازہ نہ تھا کہ یہ رفتہ رفتہ پریشان کن صورت اختیار کر لے گی، چودھری محمد حسین مرحوم کے ساتھ اس موضوع پر کئی مرتبہ باتیں ہوئیں وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے کنبے کے افراد کی عمریں خاصی لمبی ہوتی ہیں، حضرت کے والد ماجد نے پچانوے سال کی عمر پائی، ان کی والدہ ماجدہ کی وفات اٹھہتر سال کی عمر میں ہوئی، برادر اکبر ان سے پندرہ سال بڑے ہیں اور بفضل اللہ ان کی صحت اچھی ہے لیکن وہ بھائی سے بھی دو سال پیشتر رخصت ہو گئے اور خاندان کی یہ رسم قائم رکھی کہ چھوٹا بھائی بڑے سے پیشتر وفات پاتا ہے، شیخ عطا محمد مرحوم (حضرت کے بڑے بھائی) وفات کی خبر پاکر سیالکوٹ سے آئے تھے تو آہ بھر کر کہا تھا کہ مجھے یقین سا تھا، اس مرتبہ خاندان کی یہ رسم بدل جائے گی، افسوس کہ نہ بدلی۔

میں ۲۱ کی صبح کو معمول کے مطابق بہت سویرے سیر کو نکل گیا تھا واپس آکر نہا رہا تھا

کہ چودھری محمد حسین پھاٹک میں داخل ہوئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ کوئی بہت ہی ضروری کام معلوم ہوتا ہے۔ ذرا قریب آئے تو فرمایا۔ دیکھو بھئی جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب جلد تیار ہو جاؤ۔ یہ الفاظ کان میں پہنچے اور جسم سر سے پاؤں تک سُن ہو گیا۔ دو چار منٹ میں کپڑے پہنے۔ دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ بات منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اسی حالت میں سالک مرحوم، چوہدری صاحب اور میں جاوید منزل پہنچے۔ دن کا بیشتر حصّہ حضرت کے عزیزوں اور دوستوں میں گزر گیا جو جمع تھے۔ ایک مرتبہ جسدِ مبارک کو ذرا سہارا دینے کی ضرورت پڑی۔ میں نے اٹھایا۔ بے جان جسم کا بوجھ تو بہت زیادہ تھا لیکن پورا جسم ریشم کی طرح ملائم تھا۔ شاہی مسجد کے بیرونی احاطے میں مرقد کے لیے جگہ تجویز ہوئی۔ عصر کے وقت میّت وہاں پہنچی۔ ہم تو بہت پہلے مرقد پر پہنچ گئے تھے۔ میّت کے ساتھ قدم قدم چل کر بازاروں سے گزرتے ہوئے پہنچنا ممکن نہ تھا۔ مغرب کے قریب میّت پہنچی۔ اسے قبر میں اتارا۔ دفن کیا اور واپس ہوئے۔ بعد میں سُنا کہ اہل شہر نے نیز ان بے شمار افراد نے جو آس پاس کے شہروں مثلاً امرتسر، سیالکوٹ، وزیر آباد، گوجرانوالہ وغیرہ سے آ گئے تھے اصرار کیا کہ انہیں بھی میّت کو کندھا دینے کا موقع ملنا چاہیے اس غرض سے جنازے کو بانس لگائے گئے تاکہ بہت سے لوگ کم از کم ایک بار ضرور کندھا دینے کی سعادت حاصل کر سکیں۔ یہ اس محبوب وجود کی ہمہ گیر محبوبیّت کا ایک کرشمہ تھا۔ جس نے پوری زندگی خاموشی اور گوشہ نشینی میں گزاری۔ لیکن اس بیش بہا زندگی کا کوئی بھی لمحہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے اسلام، مسلمانوں اور انسانیت کی بہبود و فلاح کے سوا کبھی کچھ سوچا ہو یا اس کے سوا زبان مبارک پر آیا ہو۔

(غیر مطبوعہ)

علّامہ اقبال کی زندگی کا آخری دور

عظمت موت کے دروازے پر

حضرت علامہ مرحوم کی وفات پر گیارہ برس گزر چکے ہیں یہی دن تھے میں معمول کے مطابق صبح کی سیر سے واپس آکر نہا رہا تھا کہ خلاف معمول برادر محترم چودھری محمد حسین صاحب آئے اور یہ دلدوز خبر سنائی کہ جس محبوب و محترم ہستی کے فیوض صحبت سے استفادہ میں ہوشمندی کا بیشتر حصّہ گزارا تھا، وہ اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی:

ہر چند ز پے چشم عزیزاں نگراں بود
رفتیم و نہ کردیم نگاہے بہ قضا ہیچ

وہ ہوش ربا خبر، وہ وقت اور وہ لمحہ اب تک دل پر نقش ہے مرحوم کی بیماری بہت پہلے اس منزل پر پہنچ گئی تھی کہ نظر بہ ظواہر ان کے صحت یاب ہونے کی امید مضمحل ہو چکی تھی لیکن وہ محبوب و تابناک اور متبسم چہرہ بجائے خود امید کا درخشاں آفتاب تھا اور اسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد دل مان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ آفتاب بھی غروب ہو جائے گا تاہم اس دنیا میں حیاتِ دوام کسی کے لیے نہیں، ہمیشہ کوئی نہیں جیا اور کوئی نہیں جیے گا۔ موت کا وقت سب کے لیے روزِ اوّل سے مقدر ہو چکا ہے اور علامہ اقبال اس سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتے تھے۔ کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔

شرفِ نیاز گیارہ برس کی مدت میں خدا جانے کتنے دوستوں اور عزیزوں نے تقاضے کیے کہ حضرت علامہ مرحوم پر کچھ لکھو لیکن ہمت تحریر ہی نہیں، ہمت فکر نے بھی ہر مرتبہ جواب دے دیا۔ جس حد تک مجھے یاد ہے زندگی میں کسی بلند منزلت ہستی کے ساتھ اتنا وقت گزارنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی جتنا وقت حضرت

علامہ مرحوم کے پاس گزرا۔ ۱۹۲۲ء کے موسم سرما میں ان کے ساتھ چودھری محمد حسین ہی کے ذریعہ سے گہرا ربط پیدا ہوا تھا اس وقت سے ۱۹۳۲ء تک وُہ دن انگلیوں پر گِنے جاسکتے ہیں جن میں ان کی صحبت سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ بعد میں بھی برابر حاضر ہوتا رہا اگرچہ مسلم ٹاؤن میں منتقل ہوجانے کے بعد روزانہ حاضری کے شرف سے محروم ہوگیا۔ ایسے اوقات بھی آئے کہ مسلسل گیارہ گیارہ بارہ بارہ گھنٹے انھی کے پاس گزر گئے۔ میں نے یہ التزام بھی کیا تھا کہ جو کچھ اُن سے سنتا گھر پہنچ کر اس کا ملخص لکھ لیتا۔ جس زمانے میں وُہ "زبورعجم" لکھ رہے تھے روزانہ یا دوسرے تیسرے دن مختلف غزلیں اپنے خاص انداز میں سناتے۔ وہ کتابچہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے جس میں سنے ہوئے اشعار حافظے کی مدد سے لکھ لیتا تھا۔ اکثر غزلیں پوری مرقوم ہیں بعض کے صرف مصرعے ذہن میں رہ گئے جو ذہن میں نہ رہے ان کی جگہ نقطے لگے ہوئے ہیں۔

بے مایگی کا اعتراف

لیکن یادداشتوں کے اس گراں بہا اندوختے کے باوجود ان کے متعلق کچھ لکھنے کا حوصلہ اب تک نہ ہوا۔ شروع میں صدمے کی تازگی ترتیب خیالات و افکار کی صلاحیت کو پانی بنا کر آنکھوں سے بہا دیتی تھی اور کاغذ سفینۂ اشک بن جاتا تھا۔ صدمہ محض یہ نہ تھا کہ وُہ دنیا کی نہایت بلند مرتبہ اور عالمگیر شخصیت کے حامل تھے بلکہ وُہ ایک ایسے بزرگ بھی تھے جن کے ساتھ اگرچہ خون اور نسب کا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن ذاتی تعلقات خویشوں سے بڑھ کر تھے۔ علمی اور سیاسی زندگی کے بیشتر خط و خال انھی کی شفقت بار صحبت میں درست ہوئے تھے عمل کے دامن میں جو "بضاعت مزجات" نظر آتی ہے یہ انھی کے فیضان رہنمائی کی برکت تھی۔

آنسوؤں کی نذر

اس وقت یہ احساس تھا کہ ایک بے نوا اور ناتواں مسافر لمبی اور حد درجہ کٹھن منزل طے کرچکے تو از سرِ نو سفر شروع کرنے سے پیشتر اس کے لیے ستانا اور دم لے لینا ضروری ہے، لیکن بعد میں ان کی عظمت اور

اپنی بے مایگی زیادہ واضح اور آشکارا ہوتی گئی۔ ان اصحاب تحریر کی ہمتوں پر حیرت بھی ہے اور رشک بھی جنھوں نے حضرت علامہؒ پر اب تک بہت کچھ لکھ دیا۔ مجھے اپنی بے چارگی کے اعتراف میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ دماغ اگر تیار بھی ہو تو دل مساعدت پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ۱۹۳۸ء ہی میں ان کی زندگی کے آخری دور کے متعلق چند سطریں مرتب کی تھیں وہی بہ تغیّر قلیل "چٹان" کی نذر کرتا ہوں:۔

نذر اشک بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

دو بیماریاں

حضرت علامہ کی دو بیماریاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اوّل ہر چار پانچ برس کے بعد انھیں دردِ گردہ کا دورہ ہو جاتا تھا۔ دوسرے وقتاً فوقتاً وہ نقرس میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ نقرس اگرچہ پاؤں کے انگوٹھے تک ہی محدود رہتا تھا لیکن شدت درد کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کپڑا ابھی انگوٹھے سے چھو جاتا تو تڑپ اُٹھتے۔

ذکاوت حس کی یہ کیفیت تھی کہ دوسرے لوگ درد کی حالت حقیقۃً وارد ہو جانے پر جتنے متالم ہوتے تھے، حضرت علامہ پر محض تصوّر ہی سے وہ حالت طاری ہو جاتی تھی۔

ایک واقعہ

ایک مرتبہ گرمیوں کا موسم تھا کہ ان کو دردِ گردہ کا دورہ ہوا اور کئی روز تک تکلیف رہی۔ میں دوپہر کے وقت ان کے پاس پہنچا تو میکلوڈ روڈ والے مکان کے چھوٹے کمرے میں (جو ان کی نشست کے کمرے سے متصل تھا) لیٹے ہوئے تھے۔ فرش کو پانی ڈال کر ٹھنڈا کر دیا گیا تھا۔ اس وقت اور کوئی پاس نہ تھا۔ تھوڑی دیر سرسری باتیں ہوتی رہیں پھر ایک اور صاحب تشریف لے آئے۔ حضرت نے لیٹے لیٹے اچانک مجھے مخاطب کر کے پوچھا کہ انسان پر جو تکلیف آتی ہے خدا کی طرف سے ہوتی ہے یا خود انسان کے نفس کی طرف سے؟ میں عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ اس حقیقت کو مسئول سے بہتر جانتے ہیں[1]،

---

[1] میرے ذہن میں اس حدیث شریف کے الفاظ تھے جو حدیث جبریلؑ کے نام سے مشہور ہے یعنی قیامت کے متعلق سوال

(باقی برصفحہ آیندہ)

لیکن جو صاحب پاس بیٹھے تھے انھوں نے میری بات کاٹ کر بے تکلفی سے فرما دیا: "ڈاکٹر صاحب! جو کچھ ہوتا ہے خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔" یہ الفاظ سنتے ہی بے اختیار ایک درد بھری چیخ ماری، آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا بہہ نکلی۔ دو تین منٹ تک بار بار فرماتے رہے: "میری توبہ، میری توبہ۔ اگر سب کچھ اسی کی طرف سے تھا تو میں نے شکوہ کیوں کیا؟"

کھانے کی کیفیت

ان کی عادت برسوں سے یہ ہو گئی تھی کہ صرف دوپہر کے وقت کھانا تناول فرماتے۔ رات کے وقت یا تو تھوڑا سا دلیہ دودھ ڈال کر کھا لیتے یا بالکل کچھ نہ کھاتے۔ سردیوں کے موسم میں رات کے نو بجے کے قریب دو "ختائیاں" کھاتے اور نمکین کشمیری چائے کی ایک پیالی نوش فرماتے۔

وفات سے کئی برس پیشتر درد گردہ کا ایک سخت حملہ ہوا تھا، جو کئی دن تک جاری رہا۔ اس زمانے میں خواجہ حسن نظامی کے مشورے کے مطابق حکیم عبدالوہاب مرحوم عرف نابینا حکیم صاحب کا علاج کرایا جس سے بڑا فائدہ ہوا۔ اس کے بعد جب کبھی کوئی تکلیف محسوس ہوتی تو حکیم صاحب کو کیفیت لکھ بھیجتے اور دہلی سے دوا آجاتی۔ کھانا بہت کم مقدار میں کھاتے۔ پلاؤ اور سیخ کے کباب بہت مرغوب تھے۔ اگر دو چار روز متواتر سیخ کے کباب کھا لیتے تو تکلیف ہو جاتی۔

آم سے رغبت

میووں میں سے آم انھیں بہت پسند تھے۔ ان کے نیاز مند اور دوست دُور دُور سے قسم قسم کے آم تحفۃً بھیجتے اور ہم نیاز مندوں کو موسم میں کئی بار کھانے کا موقع ملتا۔ میاں نظام الدین مرحوم رئیس اعظم لاہور موسم میں بعض اوقات دو تین بار یا کم از کم ایک بار حضرت کو بعض خاص نیاز مندوں سمیت اپنے باغ میں لے جاتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما المسئول باعلم من السائل"۔ یعنی جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سوال کرنے والے سے بہتر نہیں جانتا۔

قسم قسم کے آموں سے چونچے بھروا دیتے اور کئی کئی گھنٹے انبہ خوری کا سلسلہ جاری رہتا۔
حضرت فرمایا کرتے تھے کہ قدرت نے میووں کو ترقی دیتے دیتے انگور بنائے انگوروں میں جو کمی رہ گئی تھی وہ آموں کی تخلیق سے پوری کردی۔ بعض اوقات فرماتے کہ میوے صرف چند ہیں اکثر میووں کی حیثیت وہی ہے جیسے ہندوؤں میں "اچھوتوں" کی ہے۔

مرض الموت کا آغاز

عید کی نمازیں شاہی مسجد میں پڑھا کرتے تھے ۱۹۳۴ء کی نماز عید الفطر[1] پڑھ کر واپس آئے تو گرم گرم دودھ ڈال کر سویاں تناول فرمائیں اس کے بعد آواز یکایک بیٹھ گئی ابتدا میں تشخیص کا معاملہ مشتبہ سا رہا۔ حضرت نے حکیم نابینا مرحوم کی طرف رجوع کیا۔ ان کے علاج سے کسی قدر فائدہ ضرور ہوا، لیکن مرض کا ازالہ نہ ہو سکا۔ بعض ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ جو رگ حلق سے دل کی طرف جاتی ہے اس میں رسولی پیدا ہو گئی ہے، اس لیے عمل جراحی ضروری ہے بعض کی رائے تھی کہ بجلی کے ذریعہ سے بھی علاج ممکن ہے چنانچہ اس سلسلے میں حضرت مرحوم دو مرتبہ فرماں روائے بھوپال اور راس مسعود مرحوم کی دعوت پر بھوپال گئے، جہاں بجلی کے ذریعہ سے علاج کا اچھا انتظام تھا۔ ایک مرتبہ عمل جراحی کے لیے ولایت جانے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔

گوشہ نشینی

باہر نکلنے کے زیادہ عادی نہ تھے لیکن جب تک آواز نہیں بیٹھی تھی ہائی کورٹ میں مقدمات کی پیروی کے لیے چلے جاتے تھے جس روز کوئی پیشی نہ ہوتی، عموماً نہ جاتے۔ آواز کی تکلیف شروع ہو جانے کے بعد ہائی کورٹ جانا بھی بند ہو گیا۔
میرے علم کے مطابق آخری مرتبہ وہ اس وقت گھر سے باہر نکلے تھے جب فرماں روائے بہاول پور لاہور آئے تھے اور انھوں نے دارالافتا کے قیام کے سلسلے میں مشورے کے لیے حضرت مرحوم کو بلایا تھا یہ غالباً انتقال سے تین چار مہینے پیشتر کا واقعہ ہے۔

---

[1] یہ ۱۳۵۲ھ کی عید الفطر تھی جو ۱۷ جنوری ۱۹۳۴ء کو ہوئی۔

بیگم صاحبہ کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوگیا۔ یہ صدمہ عام حالات کے اعتبار سے بھی بڑا ہی دردناک اور الم انگیز ہوتا، لیکن حضرت علامہ مرحوم کے خاص حالات کے اعتبار سے تو اس کی الم انگیزی بیان سے باہر تھی۔ ان کے دونوں بچے (جاوید اور منیرہ) کم عمر تھے۔ واقف حال نیازمندوں پر روشن تھا کہ بیدم المثال صبر و ضبط کے باوجود یہ صدمہ ان کو گھلائے جارہا ہے اس کی وجہ سے ان کی بیماری بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔

وصیت اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ان کے دل کو یقین سا ہوگیا تھا کہ اب زندگی بہت تھوڑی باقی رہ گئی ہے لہٰذا ایک روز تنہائی میں بیٹھ کر اپنے قلم سے وصیت لکھی اور اسے رجسٹرار کے پاس بھیج دیا اس کے بعد جو کچھ ضروری معلوم ہوا اسے علیحدہ لکھ کر محفوظ کر دیا۔

وصیت میں انھوں نے چار آدمیوں کو بچوں کے گارڈین مقرر فرمایا تھا، چودھری محمد حسین ایم۔ اے مرحوم منشی طاہرالدین مرحوم، شیخ اعجاز احمد صاحب (برادر زادہ حضرت علامہ)، خواجہ عبدالغنی مرحوم جو بچوں کے حقیقی ماموں تھے۔

خواجہ عبدالغنی کا بھی انتقال ہوگیا۔ چودھری محمد حسین مرحوم نے جو علامہ اقبال کے عزیز ترین رفیق اور خاص راز دار تھے، حضرت مرحوم کے ارشادات و وصایا کو جس اہتمام سے پورا کیا اس دور میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ حق شناسی، ایثار دوستی اور کمال ادائے فرض کے اعتبار سے ایسی شخصیت غالباً اب شاید ہی پیدا ہو جیسے چودھری صاحب مرحوم و مغفور تھے۔

گفتار و مکالمات مرض اگرچہ بڑھ رہا تھا اور ان کی طبیعت کمزور ہورہی تھی لیکن گفتار و مکالمات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اسی طرح باتیں کرتے جس طرح تندرستی کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔ علمی اور سیاسی مباحث کا انداز بھی وہی تھا۔ نکتہ سنجیاں اور نکتہ طرازیاں بھی بدستور جاری تھیں۔ وفات سے چند روز

پیشتر ان کے پاس بیٹھ کر خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس زندگی میں مفارقت کا وقت اتنا قریب آ گیا ہے۔

دم کشی کا عارضہ

ضعف قلب کے باعث آخری دور میں دم کشی کا عارضہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ غسل خانے تک بھی جاتے تو سانس پھول جاتا۔ ایک روز دم کشی کے باعث بے تاب ہو کر پلنگ سے نیچے گر پڑے۔ یہ ان کے مرض کی شدت کا پہلا محسوس مظاہرہ تھا جس سے تمام نیاز مندوں کے حلقے میں گہرا اضطراب پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی نے علاج شروع کیا، جس سے تدریجاً فائدہ ہونے لگا۔ دم کشی کے دوروں کا اعادہ بھی کم ہوتا گیا اور ان کی شدت میں بھی نمایاں کمی محسوس ہونے لگی۔

علاج کی کیفیت

حکیم نابینا صاحب اس زمانے میں حیدر آباد میں تھے۔ انھیں مفصل حالات لکھ کر بھیج دیے گئے اور حکیم صاحب نے دوائیں تجویز کر کے بھجوا دیں۔ لاہور کے ماہر ڈاکٹروں نے بھی کئی مرتبہ معائنہ کیا، جن میں سے ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر جمیعت سنگھ اور ڈاکٹر یار محمد خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر محمد یوسف کی رائے پہلے دن سے یہ تھی کہ مرض لاعلاج ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ میرے تجربے کے مطابق اس قسم کے مریض زیادہ سے زیادہ سات آٹھ مہینے تک زندہ رہے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ زیادہ تر غذا اور کم تر دوا کے ذریعے سے زندگی کے باقی دن آرام سے گزارنے کا بندوبست پیش نظر رکھا جائے۔

علالت کے متعلق سکوت

مصلحتاً یہ رائے حضرت علامہ سے مخفی رکھی گئی۔ مصلحت ہی اس امر کی متقاضی ہوئی کہ ان کی علالت کی خبر اخباروں میں شائع نہ ہو۔ اوّل اس لیے کہ حضرت علامہ کی طبیعت مطمئن رہے اور طبیعت کا اطمینان و سکون تمام ڈاکٹروں اور طبیبوں کے نزدیک علاج کا بہت بڑا جزو تھا۔ دوم

Avvertenze. - *Il presente biglietto è personale, deve portare la firma del titolare e deve essere presentato ad ogni richiesta degli agenti ferroviari in servizio. Il titolare è tenuto a dimostrare la propria identità con documenti legali di riconoscimento. In caso di smarrimento il titolare deve farne immediata denuncia all'ufficio che gli ha consegnato il presente biglietto e al personale del treno o delle stazioni qualora lo smarrimento avvenga durante il viaggio. Appena scaduto di validità o ne sia cessato lo scopo, il biglietto stesso dovrà essere restituito al suddetto ufficio.*

VALE PER I TRENI DI LUSSO

IL CAPO DELLA SEZIONE

1931

CLASSE I

SERIE AL

N. 1994

MINISTERO DELLE COMVNICAZIONI
FERROVIE DELLO STATO

CARTA DI LIBERA CIRCOLAZIONE
SULLA INTERA RETE

Vale a tutto il 30 novembre 1931

Sig. Sir Mohamed Iqball

Firma del Titolare

IL MINISTRO

1931

حکومتِ اٹلی کی دعوت پر ۱۹۳۱ء میں حضرت علامہ اقبالؒ اٹلی تشریف لے گئے تھے
اس سلسلہ میں حکومتِ اٹلی نے انکے لئے ریلوے کا فرسٹ کلاس پاس جاری کیا تھا۔ اس کا عکس

اس لیے کہ لوگ مزاج پرسی کے لیے ہجوم کریں گے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ انھیں کوئی جسمانی اور دماغی زحمت نہ ہو بلکہ آرام سے لیٹے رہیں۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ انھیں زیادہ باتیں بھی نہیں کرنی چاہئیں بلکہ زیادہ غور و فکر سے بھی بچنا چاہیے لیکن یہ ایسی پابندی تھی جسے ان کا دماغ آخری دم تک قبول نہ کر سکا۔

آنکھ میں موتیا

معالجوں میں سے جس شخصیت نے مرحوم کی علالت کے آخری دور میں سب سے بڑھ کر اور انتہائی محبت و عقیدت کے ساتھ خدمات انجام دیں وہ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی ہیں حضرت مرحوم کے تمام نیاز مند حکیم صاحب ممدوح کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔

وفات سے ایک برس پہلے ایک آنکھ میں موتیا اتر آیا تھا اس وجہ سے مطالعہ بالکل بند ہو گیا۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ موتیا پک جائے گا تو اپریشن کیا جائے گا لیکن ان کی بیماری بڑھتی گئی اور اپریشن کی نوبت ہی نہ آئی۔ ان کی بینائی کم ہو گئی تھی یہاں تک کہ ملاقاتی جب تک بالکل قریب نہ پہنچ جاتا یا اس کا نام نہ بتا دیا جاتا وہ اسے پہچان نہ سکتے۔

مرض کا نشیب و فراز

مارچ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں ان کے پاؤں اور چہرے پر ورم کے آثار نمودار ہوئے یہ اس بات کی علامت تھی کہ گردے ٹھیک کام نہیں کر رہے۔ دل کے متعلق حکیموں اور ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ وہ پھیل گیا ہے اور اس کی حالت اچھی نہیں۔ طبی اصطلاح میں اس بیماری کا نام "اتساع قلب" تھا، لیکن دوا اور غذا کی پابندی سے طبیعت بہتر ہونے لگی۔ دم کشی کے دورے بھی کم ہو گئے۔ بھوک لگنے لگی۔ فی الجملہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیماری کی شدت کم ہو رہی ہے لیکن اصلاح مزاج کی یہ کیفیت مستقل و پایدار ثابت نہ ہوئی۔

ضبط و تحمل

حضرت علامہ کی ذکاوتِ حس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس شدید علالت کے دنوں میں وہ ضبط و تحمل کا پیکر بن گئے تھے۔

ان کے مختلف ارشادات پر اب غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ موت کے قرب کا انھیں یقین ہو چکا تھا، لیکن اپنے نیازمندوں اور خدمت گزاروں کے سامنے وہ کبھی ایسی بات نہ کہتے، جس میں اضطراب یا بے چینی کی جھلک ہوتی۔ کئی مرتبہ دیکھا کہ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو حضرت نے فرمایا مجھے اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں میرے دوستوں اور تیمارداروں سے پوچھیے کہ ان کا اطمینان ہوا یا نہیں؟ اگر وہ مطمئن ہیں تو میں بھی مطمئن ہوں۔

دل کا معاملہ

ایک دفعہ دفعتاً ان پر رقّت طاری ہو گئی دیر تک روتے رہے جب طبیعت بحال ہوئی اور رقت کا سبب پوچھا گیا تو فرمانے لگے ایک شعر یاد آگیا تھا، یعنی

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگِ محتسب
بر دلِ ما آمد و ایں آفت از مینا گزشت

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شعر میر رضی دانش کا ہے اس نے "بر دل آمد" کی جگہ "بر سر آمد" لکھا تھا لیکن حضرت علامہ نے اس میں حد درجہ موزوں تصرف کر لیا کیونکہ یہ شعر ہماری دل کے حسبِ حال تھا اس لیے رقت طاری ہو گئی۔

موت کی پیشوائی

۲۰ مارچ کی شام کو میں اور برادرم سالک مرحوم حاضر خدمت ہوئے تو بظاہر طبیعت کسی قدر بہتر معلوم ہوتی تھی۔ وہ خود فرمانے لگے "اب تو کمرے کے اندر تھوڑا سا چل پھر بھی لیتا ہوں ہم نے عرض کیا کہ خدا کے فضل سے چند روز میں اتنی صحت ہو جائے گی کہ آپ کوٹھی کے صحن میں چہل قدمی فرمایا کریں گے۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا بلکہ خندہ پیشانی کے ساتھ اس کی پیشوائی کے لیے تیار ہوں ساتھ ہی اپنی یہ رباعی سنائی:

سحرہا در گریبان شب اوست — دو گیتی را فروغ از کوکب اوست
نشان مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم برلب اوست

حضرت مرحوم نے زندگی کے آخری ایّام میں یہ خیال کئی صاحبوں کے سامنے دہرایا انتقال سے چار روز پیشتر ایک جرمن عالم ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا اس سے بھی یہی کہا تھا۔

علمی مسائل اور خبریں

اس جرمن عالم کے ساتھ فلسفہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈارون اور نٹشے کے افکار کا خلاصہ حضرت نے صرف دو تین فقروں میں اس جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا کہ مخاطب حیران رہ گیا۔ حضرت مرحوم اس حالت میں بھی دقیق سے دقیق علمی سوالات کے جواب بے توقف دیتے اور اس انداز میں دیتے کہ سائل کے دل اور دماغ دونوں کی تسکین ہو جاتی۔

اس دور میں بھی خبریں روزانہ سنتے اور کرید کرید کر ہر خبر کی تفصیل پوچھتے۔ دو باتیں آخری دم تک سیاسیات میں ان کی دلچسپی کا خاص مرجع رہیں: اوّل یہ کہ مسلمانوں کی بہتری کے لیے کوئی صورت پیدا ہوئی یا نہیں، دوم یورپ کے حالات کی رفتار کیا ہے۔ انھیں جنگ کا یقین تھا اس لیے یورپی ملکوں کی تمام خبریں بڑے غور اور شوق سے سنتے تھے۔[1]

انتقال سے چند روز پیشتر حکیم محمد حسن قرشی کو ایک دو روز کے لیے راولپنڈی جانا پڑا۔ ان کی غیر حاضری میں حضرت علامہ کے بائیں جانب ورم ہو گیا جس سے پھر تشویش پیدا ہو گئی یہ ورم آخری دم تک کاملاً زائل نہ ہوا۔

زیارت حرمین کی آرزو

میں ۱۸۔ اپریل کی شام کو حاضر ہوا تو ایک صاحب حضرت مرحوم کے

---

[1] حضرت علامہ نے "خضر راہ" میں پیشگوئی کی تھی اور اس سلسلے میں ان کے پیش نظر "شمع اور شاعر" کی پیشگوئیاں بھی تھیں:

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا مآل — موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس — سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ

پاس بیٹھے تھے۔ خدا جانے پہلے کیا باتیں ہو رہی تھیں میں پہنچا تو وہ صاحب حضرت کی خدمت میں عرض کر رہے تھے کہ ابھی تو آپ کو حجاز جانا ہے۔ حضرت نے یہ سن کر فرمایا: سہارن پور سے ایک صاحب نے لکھا ہے، میں نے حرم کا طواف کرتے ہوئے بارگاہِ ایزدی میں دعا کی تھی کہ آپ کو حرم پاک میں پہنچنا نصیب ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دعا قبول ہو گئی ہے پھر فرمانے لگے کہ اب بہ ظاہر حجاز پہنچنے کی کوئی صورت نہیں لیکن دیکھیں خدا کو کیا منظور ہے:

بدن واماندہ و جانم در تگ و پوست   سوے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز   کہ من دارم ہواے منزلِ دوست

آخری ملاقات

۱۹۔ اپریل کی شام کو مولانا غلام مرشد صاحب کی معیت میں حاضر خدمت ہوا تو طبیعت اگرچہ اچھی معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن چہرہ بدستور بشاش تھا اور اس پر ہلکی سی طبعی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ کسی حرکت سے تشویش ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ چہرے کو دیکھ کر یا باتیں سن کر خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ موت کا وقت اتنا قریب آگیا ہے اور وہ بخشش بہا زندگی دنوں کی نہیں محض گھنٹوں کی باقی رہ گئی ہے۔ زندگی میں یہ ان کی آخری زیارت تھی میں دوسرے روز اسی وجہ سے نہ گیا کہ طبیعت بہ ظاہر اچھی معلوم ہوتی تھی اس کم نصیبی کا داغ دل سے کبھی دور نہ ہوگا۔

تین چار روز سے ان کے بلغم میں خون کی ہلکی سی آمیزش شروع ہو گئی تھی۔ معالجوں کی رائے تھی کہ دل کی طرف جانے والی رگ میں انشقاق کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں یہ بات بھی حضرت مرحوم سے مخفی رکھی گئی۔

۲۰۔ اپریل کی شام

۲۰۔ اپریل کی شام کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ اب طبیعت بہت خراب ہے اور زندگی صرف چند گھنٹوں کی باقی رہ گئی ہے۔ اس وقت مزید مشورے کے لیے کرنیل امیر چند کو بلایا گیا انھوں نے ایک اور دوا تجویز کی جو رات کے گیارہ بجے کے قریب پلائی گئی۔

حضرت کو ڈاکٹروں کی دوائیں ویسے بھی پسند نہ تھیں۔ کہا کرتے تھے کہ ان کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔ کرنیل امیر چند کی تجویز کردہ دوا کا ذائقہ شاید بہت بُرا تھا جس سے معدے میں امتلا کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ قے ہونے سے اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی رگ نہ پھٹ جائے۔ چنانچہ پہلے گرم پانی اور نمک کے غرارے کرائے گئے نیز الائچی کے دانے چبانے کے لیے دیے گئے پھر اکسیر عنبری کھلائی گئی۔

ڈاکٹری دوائی سے انکار

امتلا کی کیفیت جاتی رہی تو دوسری ڈاکٹری دوا پلانی تھی لیکن حضرت نے انکار فرما دیا اور کہا کہ ڈاکٹری دوائیں میں نہیں پیتا۔ یہ خلافِ انسانیت ہیں بلکہ یہ بھی فرما دیا کہ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ جب عرض کیا گیا کہ حضرت اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے آپ کا زندہ رہنا ضروری ہے تو ارشاد ہوا کہ میں ایسی دواؤں کے استعمال پر پابندی کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔ (اوکما قال)

رات کی کیفیت

جب سے موسم ذرا گرم ہو گیا تھا حضرت کا پلنگ رات کے وقت خواب گاہ سے نکال کر ڈرائنگ روم میں لے آتے تھے، ۲۰ اپریل کی شام کو فرمایا کہ گرمی زیادہ ہے، اس لیے پلنگ برآمدے میں لے آؤ پھر فرمانے لگے برآمدے میں بھی گرمی ہے اس لیے پلنگ کوٹھی کے صحن میں کر دیا گیا۔ بارہ بجے تک وہاں رہے پھر ذرا خنکی محسوس ہوئی تو پلنگ ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ متعدد نیاز مند ایک بجے تک پاس رہے پھر یہ دیکھ کر کہ طبیعت بظاہر بہتر ہے اور حضرت کو بھی نیند آنے لگی تھی اس لیے سب رخصت ہو گئے۔ صرف شفیع صاحب (جنھیں آخری دور میں حضرت کی خدمت کا موقع سب سے بڑھ کر ملا) ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب، علی بخش مرحوم اور رحماں (حضرت کے ملازم) پاس رہے۔

شدید درد کا آغاز

تین بجے تک حضرت سوئے رہے پھر آنکھ کھلی تو درد محسوس ہوا۔ شفیع صاحب کو اسی وقت حکیم صاحب کی طرف بھیجا گیا۔ حکیم صاحب اپنے مکان کی بالائی منزل میں سو رہے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ شفیع صاحب نے نہ

حکیم صاحب کے ملازم کو جگایا اور نہ خود ان کی آواز حکیم صاحب تک پہنچی وہ ناکام واپس ہوئے تو راجا حسن اختر مرحوم کو جگایا گیا جو کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں سو رہے تھے۔ حضرت نے ان سے بھی کہا کہ حکیم صاحب کو بلا لائیں۔ ان کی زبان سے بے تکلف نکل گیا کہ حکیم صاحب رات کے ایک بجے گئے ہیں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تھوڑا سا توقف کر لیا جائے؛ فرمایا آپ کو معلوم نہیں مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ راجا صاحب فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئے اس وقت حضرت نے مندرجہ ذیل رباعی انھیں سنائی جو غالباً چند روز پیشتر کہی گئی تھی:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجا صاحب کے جانے کے بعد فرمایا کہ میری چارپائی اندر (خواب گاہ میں) لے چلو اس لیے کہ فروٹ سالٹ پینے کا ارادہ تھا تاکہ ایک آدھ اجابت ہو جائے، شاید اس سے درد میں تخفیف ہو۔

آخری لمحات

پانچ بجے صبح کا عمل تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے فروٹ سالٹ تیار کیا۔ حضرت نے پہلے بھرا ہوا گلاس دیکھ کر فرمایا میں اتنا کیوں کر پی سکوں گا۔ پھر گلاس لے کر چپ چاپ پی گئے اس دوران میں علی بخش نے پلنگ کے پاس چوکی لگا دی اس وقت کمرے میں حضرت کے پاس صرف علی بخش رہ گیا۔

علی بخش نے بعد میں بتایا کہ پہلے آپ نے لیٹے لیٹے پاؤں پھیلا دیے پھر اوپر کی طرف نظریں اٹھا کر مجھے آواز دی اور دفعتہً دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "اللہ۔ میرے یہاں درد ہوا۔" اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف گرنے لگا میں نے فی الفور آگے بڑھ کر بایاں ہاتھ دل پر رکھا جہاں درد بتایا تھا اور دائیں ہاتھ سے سر کو تھام لیا یہ سب کچھ ایک منٹ میں ہو گیا۔ اس دوران میں انھوں نے خود بخود آنکھیں بند کر لیں میں نے (علی بخش نے) شفیع صاحب اور ڈاکٹر عبدالقیوم کو آواز دی جو باہر ٹہل رہے تھے وہ آئے اور دیکھا تو کہنے لگے کلمۂ شہادت پڑھو

جو کچھ ہونا تھا ہو چکا !

بندۂ مومن کا مقام

۲۱ر اپریل کی صبح کو آفتاب طلوع ہونے والا تھا سوا پانچ بجے کا وقت تھا جب انسانی زندگی کا یہ آفتاب درخشاں غروب ہوا۔

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر　　زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی　　نہ تیرہ خاک لحد ہے، نہ جلوہ گاہ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاک داں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند ؎

ایک عجیب اتفاق

ایک عجیب اتفاق ملاحظہ ہو کہ حضرت مرحوم کی کوٹھی صاحبزادہ جاوید اقبال کے نام پر بنی تھی اور اسی کی ملکیت تھی۔ حضرت مرحوم اس کے صرف تین کمرے استعمال فرماتے تھے۔ خواب گاہ، ڈرائنگ روم اور ڈریسنگ روم۔ ان تینوں کمروں کے لیے پچاس روپے ماہانہ کرایہ پیشگی ہر مہینے کی ۱۲ر تاریخ کو بنک میں جاوید کے نام جمع کرا دیتے تھے۔ ۲۱ر اپریل کی صبح کو ان کا انتقال ہوا۔ یہ ۲۱ر مارچ کو ادا کیے ہوئے کرایہ کا آخری دن تھا۔

مرد مومن کی نشانی

یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ انتقال کے بعد ان کے چہرے پر ہلکا سا تبسم صاف نمایاں تھا۔ ہزاروں آدمیوں نے چہرۂ مبارک دیکھا۔ ہر شخص شہادت دے گا کہ وہ جو بار بار فرماتے تھے کہ میں موت کی پیشوائی خندہ پیشانی سے کروں گا تو اس کی تصدیق ہو گئی۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد انتقال کی اطلاع پا کر سیالکوٹ سے آئے تو سب سے پہلے چہرہ دیکھا اور کہنے لگے کہ بس اتنا ہی دیکھنا تھا کہ وہ جو کچھ بار بار کہا کرتے تھے، عملاً پورا ہوا یا نہیں۔

میں نے انتقال سے تین گھنٹے بعد ان کے جسد کو اٹھایا تھا تو جسم پھول کی طرح ملائم محسوس ہوتا تھا پھر لٹا کر پاس کھڑا ہوا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ قبلہ رُخ ہو کر اطمینان کے

ساتھ سو گئے ہیں۔ چہرے یا پیشانی یا لبوں پر درد یا تکلیف یا ناآسودگی کی کوئی کیفیت نمایاں نہ تھی بلکہ بہ حیثیت مجموعی تبسم کھیل رہا تھا۔ شاید یہی عملی تشریح تھی اس شعر کی کہ:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

("چٹان" - لاہور ۲۵- اپریل ۱۹۴۹ء)

حضرت علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

نذرِ اشکِ بیقرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

حضرت علّامہ اقبال اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ بقا صرف اللہ کی ذات کے لیے ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔ ڈاکٹر کئی مہینوں سے محسوس کرا رہے تھے کہ اب اس وجودِ مقدس و محترم سے دینوی مفارقت کا وقت قریب آپہنچا ہے جس کی فیض بار صحبت میں ہم بیس برس تک علم و حکمت کے موتیوں سے دامن بھرتے رہے اور جس کی معیت کا ایک ایک ثانیہ اس دنیا کی دوسری صحبتوں کے دنوں نہیں بلکہ مہینوں اور برسوں سے بھی زیادہ بیش بہا تھا۔ لیکن دل اس مفارقت کو اتنی جلدی ممکن الوقوع سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس تابندہ چہرے پر جسمانی تکالیف کے ہجوم میں بھی اُمید کی ایسی روشنی نظر آتی تھی کہ ہم یہ تصوّر ہی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اتنی جلدی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے والا ہے۔ جس زبان نے پچاس برس تک نہ محض مسلمانوں کو بلکہ ساری دنیا کو اجتماعی زندگی کا حیات افروز پیغام دیا، وہ زبان بیماری کے دوران میں بھی اسی طرح حقائق کے گوہر برساتی تھی جس طرح صحت و تندرستی کے بہترین دور میں برساتی رہتی تھی۔ اس وجہ سے خیال نہیں ہوتا تھا کہ اس کے بند ہو جانے کا وقت اتنا قریب آگیا ہے۔ لیکن جو کچھ پیش آنے والا تھا اس تیزی کے ساتھ پیش آگیا کہ کل اس وجودِ مقدس کے آخری سفر کی منزل بھی طے ہو چکی اور اب ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں کے ماتم کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ یہ ماتم تا دمِ مرگ ساتھ رہے گا۔

عالمگیر شخصیت | حضرت علّامہ اقبال کسی ایک دور، ایک ملک اور قوم کی شخصیت نہ تھے۔

بلکہ وہ عالمگیر شخصیت کے مالک تھے دنیا کا بڑا حصّہ محض انہیں ایک نادر روزگار شاعر کی حیثیت میں جانتا ہے لیکن جن خوش نصیبوں کو اس دریائے فیض کے کنارے پر اپنی زندگیاں گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی وہی جانتے ہیں کہ شاعری کا بہتر سے بہتر تصوّر بھی قائم کر لیا جائے، تو حضرت علاّمہ کی ذات گرامی پر اس کا اطلاق اس شخصیت عظمیٰ کی وسعت زمان و مکان کے اعتبار سے کس درجہ نارسا تھا۔ "سِول" نے لکھا کہ جب تک اُردو اور فارسی کا ایک لفظ بھی دنیا میں بولا جاتا رہے گا اس وقت تک حضرت علاّمہ کی ذاتِ گرامی کی یاد بحیثیت شاعر تازہ رہے گی۔ یہ خیال بلاشبہ درست ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں جب تک علم و حکمت باقی رہیں گے، جب تک انسانیت کی تحسین و اصلاح کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس وقت تک اس حکیم یگانہ اور اس مصلح اعظم کی یاد تازہ رہے گی اس لیے کہ عالم انسانیت کی صلاح و فلاح کے سمندر میں جتنا بڑا تہیج و محرک حضرت علاّمہ کی ذاتِ گرامی نے پیدا کیا اتنے بڑے تہیج کی مثال صدیوں میں بھی نہیں ملتی۔

سب سے بڑا مسلمان اور سب سے بڑا ہندوستانی

حضرت علاّمہ مرحوم ہندوستان کی ایک غریب قوم کے فرد تھے، وہ اس دور میں پیدا ہوئے جب کہ یہ قوم اجتماعی زندگی کے تمام دائروں میں تباہ حال تھی، اس میں اُوپر اٹھنے ابھرنے اور آسمان کے نیچے عزّت مندانہ مقام تلاش کرنے کی ہمت اور سکت موجود نہ تھی، اس دور میں کئی بزرگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے خیال اور مذاق کے مطابق اس قوم کی دستگیری اور راہنمائی کی کوششیں کیں، کسی نے تعلیم کو سنبھالا، کسی نے سیاسی خدمت کا دائرہ اختیار کیا، کسی نے مذہبی احیا کو اپنا وظیفہ قرار دے لیا اور سب کی کوششیں مشکور ہیں، ان سب کی ہستیاں واجب الاحترام ہیں، لیکن حضرت علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا دائرہ خدمت سب سے زیادہ وسیع اور سب سے بڑھ کر اہم تھا انہوں نے قومی زندگی کے حقیقی سرچشمہ میں بے پناہ تحرک پیدا کیا دلوں کو سچی تڑپ بخشی، زندگی کے جذبات کو استقلال و استحکام دیا، دماغوں میں بلندی و رفعت کی طلب پیدا کی اور قوم کے مزاج، مذاق اور فطرت کو بدل کر اس مقام پر پہنچا دیا جہاں

سے عزّت مندانہ زندگی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ مسٹر جناح نے جو یہ کہا ہے کہ حضرت علّامہ مرحوم کی عظیم الشان خدماتِ ملک و ملّت اتنی بے شمار ہیں کہ انہیں بلا تکلّف بڑے سے بڑے ہندوستانی کی خدمات کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہے تو یہ درحقیقت اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، علّامہ مرحوم دورِ حاضر کے سب سے بڑے مسلمان تھے اور وہ زمانہ دور نہیں جب کہ اس حقیقت کا بھی عام طور پر اعتراف کیا جائے گا کہ وہ سب سے بڑے ہندوستانی بھی تھے۔

"چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد"

ان کا پیغامِ زندگی رہتی دنیا تک باقی رہے گا وہ ان چند افراد میں سے تھے جن کی قدر و منزلت ان کی زندگی میں بھی کافی ہوئی، وہ عمر بھر زیادہ تر گوشہ نشین رہے، اور بہت کم پبلک میں آئے لیکن دنیا کی بڑی بڑی شخصیتیں ان کے زاویہ عزلت میں جا کر فیض یاب ہونا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتی رہیں ان کی بیماری کی اطلاعات بالاہتمام روکی گئیں اور ان کی موت دفعتہً ہوئی، موت سے صرف بارہ چودہ گھنٹے بعد ان کو آغوشِ خاک میں سُلا دیا گیا، لیکن ان کے جنازے میں ساٹھ ستر ہزار آدمی شریک ہوئے اور ان میں دنیوی وجاہت کے بڑے بڑے پیکر شامل تھے، یہ سب کچھ اسی بات کا ثبوت ہے کہ ان کی قدر و منزلت کے شعور و احساس سے کوئی قلب بھی خالی نہ تھا لیکن ان کی عظمت و رفعت اور جلالت قدر کا حقیقی دور اب شروع ہوا ہے۔ وہ زندگی میں مجاہدانہ عزائم و مقاصد کے سب سے بڑے داعی تھے لیکن ان کی فطرت سراپا محبّت تھی، دنیا کے عظیم الشان انسانوں میں سے وہ اس قلیل الافراد گروہ مقدس کے ایک فرد تھے جنہوں نے حتی الامکان کسی کی خفیف سی دلآزاری بھی گوارا نہ کی، وہ کسی کے بھی رقیب نہ بنے لیکن ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو ان کی عظمت و جلالت کو دیکھ کر انہیں اپنا رقیب سمجھتے تھے، اب رقابت کے اس وہم کے لیے بھی گنجائش باقی نہیں رہی، اب وقت آیا ہے کہ دنیا اقبال کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھے، اب وقت آیا ہے کہ اس کے حقیقی کام کے تمام جوہر آشکارا ہوں، اب اس نادر روزگار شخصیت کی عظمت کے صحیح اندازوں کا دور شروع ہوا ہے۔

"فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد"

وہ شہرت سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ اگرچہ شہرت ان سے کبھی بھی بے نیاز نہ ہوئی، وہ جاہ و منزلت سے ہمیشہ بے پرواہی نہیں بلکہ نفور رہے ان کی فطرت و طبیعت درویشانہ تھی، یہ جو ان کے کلام میں بار بار نظر آتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو "فقیر"، "درویش" اور "قلندر" کہہ کر پکارتے ہیں، تو یہ کوئی شاعرانہ تخیل آرائی نہ تھی بلکہ ان کی فطرت کے صحیح احساس کا اظہار تھا۔ جو لوگ ان کی صحبت سے صرف ایک دو مرتبہ مستفید ہوئے وہ بھی اپنے ایمانوں کی تازگی کے معترف آئے اور بار بار ان صحبتوں کو زندگی کے بہترین اوقات میں شمار کرتے ہوئے پائے گئے۔ ہم کیا عرض کریں جن کے بیس برس کے لیل و نہار کا بڑا حصہ اس جلیل القدر ہستی کے فیض پرور سایہ میں گزرا اور جنہیں خلوت و جلوت دونوں میں سے بڑے سے بڑا حصہ ملا لیکن تشنگی ہنوز باقی ہے اور زیادہ نہ ملنے کی حسرت تادمِ مرگ باقی رہے گی۔

دہرا ماتم

دنیا کے لیے ایک رنج و قلق ہے کہ اقبال جیسی شخصیت دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی، ہمارے لیے اس عام رنج و قلق پر یہ زہرہ گداز رنج و قلق بھی مستزاد ہے کہ ایک سراپا محبت و شفقت بزرگ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جس کی صحبت میں خدا جانے کتنے ٹوٹے ہوئے ارادوں کی از سرِ نو درستی کا سامان ہوا اور زندگی کی منزل میں جو قابل ذکر قدم اٹھے اسی کی ہدایت و راہنمائی میں اٹھے۔ وہ جب تک زندہ تھا، دل کو لو لگی رہتی تھی کہ وہاں جانا ہے لیکن اب ..... ؟ ؟ ؟ آج پہلو میں دل نہیں بلکہ یاس و حسرت کا ایک ٹکڑا ہے جو ابھی تک اپنی سوگواری کی وسعت کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکا بار بار سوال پیدا ہوتا ہے: ؎

جس کے آوازے سے لذّت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

در و دیوار سے اس سوال کا صرف ایک جواب ملتا ہے۔ ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننا بہ بار

اب احباب کے گلے مل کر رو لینے کے سوا اور کیا باقی ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ کُلُّ مَن عَلَيهَا فَانٍ وَّيَبقَىٰ وَجهُ رَبِّكَ ذُو الجَلَالِ وَالاِكرَامِ۔

انقلاب ۔ ۲۴ ، اپریل ۱۹۳۸ء

اقبالؒ کی شخصیّت

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

متذکرہ عنوان رُباعی حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی غیر مطبوعہ کتاب ارمغانِ حجاز میں سے ہے۔ یہ آج سے غالباً تین چار مہینے پیشتر کہی گئی تھی، جب کہ حضرت علاّمہ مرحوم کو یقین ہو چکا تھا کہ زندگی کا وظیفہ ختم ہونے والا ہے۔ قدرت کی بخششِ حیات کا وہ دریا خشک نہیں ہو گیا جس سے حضرت علامہ اقبال جیسے شہوار موتی پیدا ہوئے۔ لیکن زمانے کے عام حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اس خاک سے پھر کوئی ایسا ہی دانائے راز اُٹھے گا، جیسے کہ حضرت علاّمہ مرحوم و مغفور تھے؟ غالب نے کہا تھا،

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختۂ
چُوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

لیکن اقبال جیسے آتش نفس کی پیدائش کے لیے تو عمروں نہیں بلکہ دوروں کے گزر جانے کا انتظار کھینچنا چاہیئے، پھر بھی ایسی ہستی مل جائے تو اسے قدرت کی خاص رحمت سمجھنا چاہیئے۔

صدمہ کی شدّت اور تازگی

ہم نے اشاعتِ سابقہ میں جو کچھ عرض کیا تھا وہ زخموں سے چُور دل کے چند درد بھرے نالے تھے، زخم ابھی تک اتنے تازہ ہیں کہ گویا ان سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ ابھی تو صدمے کی شدّت نے شعور کو اتنا سنبھلنے بھی نہیں دیا کہ ہم اپنے نقصان و ضیاع کی وسعت و پہنائی کا صحیح اندازہ کر سکیں، اور سوچ سکیں کہ ہمارے ماتم و سوگواری کی سرحدیں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ابھی تو یہ عالم ہے کہ جب کچھ لکھنے کے لیے بیٹھتے ہیں اور وہ شخصیت عظمیٰ اپنی گوناگوں محبوبیتوں اور شفقتوں کے ساتھ چشمِ تصوّر

کے سامنے آجاتی ہے تو دل و دماغ کی ساری قوتیں پانی بن کر آنکھوں کی راہ اختیار کر لیتی ہیں، اور صفحہ کاغذ پر حروف کی بجائے آنسو گرنے لگتے ہیں، ہم کیا عرض کریں کہ کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن کچھ بھی کہا نہیں جاتا۔

عظمت و برتری کا مقامِ بلند

حضرت علامہ اقبال کی زندگی میں عظمت و برتری اور شہرت و ہر دلعزیزی کی بیش بہا سے بیش بہا متاع ان کے قدموں پر گری رہی، اس دور میں دوسری کون سی شخصیت ہے جس کے استقبال و پذیرائی کے لیے انسانی قلوب کے دروازے اسی طرح مفتوح ہوئے جس طرح علامہ اقبال کے لیے ابتدا ہی سے مفتوح رہے، کون سی شخصیت ہے جس کی ہر آواز کانوں سے دل تک پہنچی اور خون کے اندر جذب ہو کر خیالات و افکار اور مقاصد و عزائم کی دنیاؤں میں نئی بہاروں کا سامان بنی، یہ بالکل سچ ہے کہ ان کی صدا ہر دل نے پوری طرح نہ سمجھی، ان کی نغمہ ریزیوں کے مقام و محل کا اندازہ ہر دماغ کر ہی نہیں سکتا تھا لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی پکار جس شخص تک بھی پہنچی وہ بے تاب و مضطرب ضرور ہوا اور اس کے دل میں یہ تڑپ ضرور پیدا ہو گئی، کہ یہ پکار پھر اس تک پہنچے اور یہ صدا پھر اس کے کانوں سے ٹکرائے، اس دور کا کون سا انسان ہے جس کو زندگی میں محبوبیت کا یہ مقامِ بلند نصیب ہوا ہو، سچ پوچھو تو ان کی عظمت و برتری کے اندازے اور ان کے استقبال و پذیرائی کے صحیح شعور کا دور اب شروع ہوا ہے۔

درویشانہ زندگی

ان کے حالات بڑی تیزی سے بدلے، ولایت جانے سے پہلے وہ پروفیسر شیخ محمد اقبال تھے، ولایت سے واپس آئے تو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال بن کر آئے، وہ شروع میں ایک حساس، جدت طراز اور خوش بیان شاعر تھے، پھر ملتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کے پُرتاثیر داعی بن گئے، اس سے بھی آگے بڑھیے تو ان کی زبان نے قوموں اور جماعتوں کی زندگی کے حقائق کی ترجمانی اختیار کر لی، اور وہ دورِ حاضر کے مصلح اعظم اور حکیم امم و ملل بن گئے، وہ دنیوی وجاہت کے کبھی طلبگار نہ ہوئے لیکن دنیوی وجاہت بھی انہیں بوجہ اتم حاصل ہوئی، دورِ حاضر کے بادشاہوں اور حکمرانوں تک نے ان کی ذاتِ گرامی سے براہِ راست

تعلقات پیدا کرنا باعثِ شرف جانا لیکن ان تمام ارتقائی منازل میں ان کا طریقِ زندگی وہی رہا جو پہلے دن اختیار کر لیا تھا۔ وہی مادہ بود و ماند، وہی بے تکلف نشست و برخاست، وہی عام فیض باری و فیض رسانی۔ ان کی بارگاہِ گیر و دار اور حاجب و دربان سے یک قلم پاک تھی۔ اگر کوئی آیا تو اسے باریابی کے لیے اذن کی ضرورت نہ تھی۔ اگر بیٹھ گیا تو گھنٹوں بھی بیٹھا رہے لیکن اس کا بیٹھنا باعثِ بار و تکدر نہیں تھا۔ اگر کوئی نہیں آیا تو اس کے بُلانے پر اصرار نہ تھا۔ البتہ جن نیازمندوں پر خاص شفقت تھی انہیں دن میں کئی کئی بار بھی بے تکلف بُلا لیتے تھے۔ اور بعض اوقات گھنٹوں روک رکھتے تھے۔ جب وہ عالمگیر عظمت و شہرت کے بلند مقام پر نہیں پہنچے تھے۔ اس وقت بھی یہی دستور تھا اور جب سارے زمانے کی آنکھیں ان پر جمی ہوئی تھیں تو اس وقت بھی یہی دستور بال برابر تغیر کے بغیر قائم رہا۔

عشقِ رسُول

وہ فطرتاً بے حد حسّاس تھے بلکہ اگر کہا جائے کہ سراپا احساس تھے تو غالباً مبالغہ نہ ہوگا۔ طبیعت میں رقت بہت تھی۔ بالخصوص حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کا اسمِ پاک زبان پر آتے ہی چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ حضرت علّامہ کا عشق بیان کا متحمل نہیں۔ ان کی تصانیف میں جو اشعار حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جسے انہوں نے سُنا ہو اور اس پر بے اختیار اشکبار نہ ہوئے ہوں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ خود خوشی خوشی شعر سُنانے لگتے۔ لیکن کوئی نعتیہ شعر یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے متعلق کوئی اشارہ آجاتا تو رقت طاری ہو جاتی۔ پندرہ پندرہ بیس بیس منٹ تک یہ کیفیت طاری رہتی۔ یہاں تک کہ باقی شعر بھی ناشنید ہی رہ جاتے۔

بے تکلّف ملاقاتیں

آج کتنے بڑے آدمی ہیں جو ہر امیر و غریب سے یُوں بے تکلّف ملتے ہوں جیسے حضرت علّامہ مرحوم اور وہ دورِ حاضر کے واقعی

مؤتمر عالم اسلامی کی کانفرنس میں علامہ اقبالؒ اور ان کے پیچھے (سگریٹ پیتے ہوئے) مولانا غلام رسول مہر

سب سے بڑے آدمی تھے، بلاشبہ مصروف آدمیوں کے لیے اپنے اُوپر پابندیاں عائد کر لینا ضروری ہے اور یہ کوئی گناہ نہیں، لیکن حضرت علّامہ کی ذات نے کبھی ایسی پابندی کو گوارا نہ کیا۔ ان کا سارا وقت مختلف ملاقاتیوں کے ساتھ اس طرح گزر جاتا تھا کہ بعض اوقات تعجّب ہوتا تھا کہ وہ کس موقع پر کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور کس وقت شعر کہتے ہیں۔

شعر گوئی کے دور

شعر گوئی کا سلسلہ بڑا عجیب تھا۔ ان پر مختلف دور آتے تھے جنہیں اصطلاحِ صُوفیہ میں بسط و قبض کے دور کہا جا سکتا ہے، جب ان پر بسط کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی تو پھر پے در پے شعر آنے لگتے۔ بعض اوقات ایسے ایک ایک دور میں دو دو سو شعر پورے ہو گئے، لیکن جب یہ دور ختم ہو جاتا تھا تو پھر شعر گوئی بند ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات راتوں کو آمدِ شعر کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو وہ پنسل سے ہر شعر کے صرف ابتدائی الفاظ یادداشت کے طور پر نوٹ کر لیتے، صُبح اُٹھ کر پوری نظم یا غزل کاغذ پر نقل کر لی جاتی تھی۔ یہ صرف چند خصوصیات ہیں، جو سمندر میں سے چند قطروں کی حیثیت بھی نہیں رکھتیں، یہ داستان بڑی طویل ہے اور اگر حیاتِ مُستعار کے کچھ دن باقی ہیں تو اسے بہر حال تدریجاً سُنانا ہے، ابھی تو صدمہ کی تازگی کے باعث اطمینان کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی صلاحیت ہی ناپید ہے۔

انقلاب،

سہ شنبہ، ۲۴ صفر ۱۳۵۷ھ،

اقبالؔ دیارِ مغرب میں

حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے تین مرتبہ دیارِ مغرب کا سفر کیا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۰۵ء میں گئے۔ اس زمانے میں وہ عالمگیر شہرت و عظمت کے مالک نہ تھے اور اس سفر کا مقصد محض یہ تھا کہ علم حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے کم و بیش تین برس انگلستان اور جرمنی میں گزارے۔ جرمنی سے فلسفے میں پی ایچ۔ڈی کا ڈپلوما لیا اور انگلستان میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔

دوسری مرتبہ وہ دوسری گول میز کانفرنس کے رکن کی حیثیت میں گئے۔ اس زمانے میں ان کے علم و فضل اور مخصوص افکار و نظریات کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی اور وہ عام طور پر یگانہ شخصیت کے مالک بن چکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں گئے اور اوائل جنوری ۱۹۳۲ء میں واپس آئے۔ سفر مراجعت میں روما اور قاہرہ میں بھی ٹھہرے۔ قدس شریف کی مؤتمر اسلامی میں بھی شریک ہوئے۔ تیسری مرتبہ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں تیسری گول میز کانفرنس کے رکن کی حیثیت میں گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر انھوں نے اسلامی آثار کی زیارت کے لیے ہسپانیہ کا سفر اختیار کیا۔ ہسپانیہ جاتے اور واپس آتے وقت پیرس میں بھی ٹھہرے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں پہلی مرتبہ وہ طالب علم کی حیثیت میں گئے تھے لیکن جن فضاؤں نے آگے چل کر انھیں برتری کے اوج کمال پر پہنچایا وہ ان کے قلب و روح میں پہلے پہل اسی سفر میں بیدار ہوئے تھے۔ یہی زمانہ ہے جب انھیں یورپی تہذیب کی بنیادی خامیوں کا پورا احساس ہوا اور انھوں نے اہل یورپ کو خطاب کرتے ہوئے پیش گوئی فرمائی کہ:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپایدار ہو گا

یہی زمانہ ہے جب ان کے قلب صافی پر اس پیغام کا پرتو پڑنا شروع ہوا جس کی تبلیغ و اشاعت میں انھوں نے بعد کی زندگی کے تمام گراں بہا اوقات صرف کر دیے۔ اس پیغام کی ابتدائی جھلک اس نظم میں دیکھی جا سکتی ہے جس کا عنوان ہے "عبدالقادر کے نام" اور اس کا ایک شعر یہ ہے:

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اسی سفر کا ایک آخری تحفہ "سسلی کا مرثیہ" تھا۔

ان کے تیسرے سفر کے زیادہ حالات معلوم نہیں البتہ "بال جبریل" میں اس سفر کے متعدد تحفے موجود ہیں۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر چونکہ میں خود بھی انگلستان گیا تھا۔ لندن پہنچنے کے بعد میرے بیشتر اوقات علامہ ہی کی بابرکت صحبت میں گزرتے رہے اور سفر مراجعت میں بھی لاہور تک ان کے ساتھ رہا تھا۔ اس لیے اس سفر کے حالات سے مجھے بلاواسطہ آگاہی کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے متعلق بعض چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت علامہ مرحوم گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے ایک نمائندے کی حیثیت میں شریک ہوئے تھے۔ اس زمانے میں مسلمانانِ کشمیر نے اپنے قومی حقوق کے حصول کے لیے ایک زبردست تحریک جاری کر رکھی تھی اور دربار کشمیر کی طرف سے ان پر سخت ظلم ہوئے تھے۔ حضرت مرحوم نے وزیر ہند یا انگلستان کے بعض دوسرے اکابر سے جو ملاقاتیں کیں ان میں وہ ہی باتیں بار بار پیش کرتے رہے، اوّل سیاسیات ہند میں مسلمانوں کے موقف کی توضیح اور ان کے مطالبات کی حقانیت، دوسرے مسلمانان کشمیر کی مظلومیت کا معاملہ۔

کانفرنس میں مسلم وفد کے ارکان متحدہ طریق پر کام کرتے رہے۔ سر آغا خاں بالاتفاق وفد کے لیڈر منتخب ہوئے تھے۔ تمام ضروری امور کے بارے میں مشورے کی غرض سے وفد کے

ارکان سر آغا خاں کی قیام گاہ پر وقتاً فوقتاً جمع ہوتے رہتے تھے۔ حضرت علامہ مرحوم ان تمام مشوروں میں شریک ہوتے رہے اور وفد کے مسلک و طرزِ عمل کے باب میں جتنے فیصلے ہوئے، ان سب میں حضرت مرحوم کی رائے اور صوابدید کا حصّہ خاص طور پر نمایاں تھا لیکن میں یہاں ان سیاسیات کی تفصیلات میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتا جن کی حیثیت آج محض تاریخ ماضی کے ایک باب کی رہ گئی ہے اور یہ تفصیلات ایک سرسری گفتگو کے بجائے مستقل تصنیف کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

اس زمانے میں دنیائے اسلام کی بعض مشہور شخصیتیں بھی لندن پہنچی ہوئی تھیں مثلاً:

اوّل۔ غازی رؤف بے جو جنگ بلقان میں ترکی کے مشہور جہاز "حمیدیہ" کے کپتان کی حیثیت میں عالمگیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ غازی کمال اتاترک نے پہلی جنگ یورپ کے بعد ترکوں کی آزادی کے لیے جہاد کو کامیابی کی منزل پر پہنچا کر جو حکومت بنائی تھی، اس میں وزیر اعظم تھے۔ چند سال پیشتر جمہوریہ ترکیہ کی طرف سے لندن میں سفیر تھے۔

دوم۔ سید ضیاء الدین طباطبائی جو ۱۹۲۱ء۔ ۱۹۲۲ء میں ایران کے وزیر اعظم تھے اور انھی کی وزارت میں رضا شاہ پہلوی مرحوم وزیر جنگ کی حیثیت سے منظر شہرت پر آئے تھے۔

سوم۔ سعید شامل قفقازی، جو سلطان شامل مرحوم مجاہد قفقاز کے پوتے تھے اور خود روسی آذربائیجان کی اسلامی جمہوریت کے صدر رہ چکے تھے بعد میں بالشویکوں نے اس جمہوریت پر قبضہ جما لیا اور مجاہد سعید ترکِ وطن کر کے پولینڈ میں مقیم ہو گئے تھے۔

حضرت علامہ مرحوم کے ساتھ ان سب نے بارہا ملاقاتیں کیں اور مختلف قومی، ملّی اور مذہبی امور کے متعلق مذاکرے کرتے رہے۔ ایک مرتبہ حضرت مرحوم نے غازی رؤف بے اور سلطان سعید شامل کو دعوت طعام بھی دی تھی، جس کی غرض یہ تھی کہ اطمینان سے ضروری بات چیت کا موقع پیدا کیا جائے۔

بعض انگریز اکابر علم استفادے کی غرض سے حضرت مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے مثلاً سر ڈین سن راس جنھیں اہل امریکہ نے اسلامی تحریکات کے متعلق لکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک حضرت علامہ کے پاس بیٹھ کر اسلامی تحریکات کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ انھوں نے بہت سی باتیں نوٹ بھی کر لیں۔ حضرت مرحوم نے دوسرے نکات کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ اسلام نظریاتی مذہب نہیں، اس کا منتہا ے مقصود یہ ہے کہ نوعِ انسانی ایک گھرانے اور ایک خاندان کی شکل اختیار کرلے[1] اکثر شاعر اور فلسفی اتحاد نوع انسانی کے خواب دیکھتے رہے اسلام نے اس غرض کے لیے ایک عملی سکیم پیش کر دی۔ اس نے رنگ، نسل، جغرافیے اور قومیت کے تمام امتیازات محو کر دیے۔ نوع انسانی کے اتحاد کے لیے اسلام کے سوا کوئی زندہ عامل موجود نہیں۔ اس کے ارکان و فرائض پر غور کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ تفریقات کو مٹانا اور محو کرنا اس کا حقیقی نصب العین ہے۔

"روزیٹا فاربیز" انگلستان کی ایک دولت مند خاتون ہے کئی ملکوں کی سیاحت کر چکی ہے اور متعدد کتابوں کی مصنف ہے۔ اس نے مسز سروجنی نائیڈو کے ذریعے سے ملاقات کی درخواست کی اور چائے پر حضرت علامہ مرحوم کو بلایا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی ملاقات میں قرآن مجید کی تعلیمات پر مذاکرہ ہوتا رہا۔

"کرنیل فیوز" کو لندن یونیورسٹی نے ہندوستان کی اسلامی تحریکات پر لکچروں کی دعوت دی تھی۔ ایک روز کرنیل صاحب ملاقات کے لیے آئے اور دیر تک اسلامی تحریکات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ آخر میں تین ادبی و علمی اجتماعات کا ذکر ضروری ہے:

۶۔ نومبر ۱۹۳۱ء کو اقبال لٹریری ایسوسی ایشن نے لندن میں ایک مخصوص اجتماع کا

---

[1] الخلق کلھم عیال اللہ (حدیث) یعنی پورا عالم انسانیت خدا کا گھرانا ہے۔

انتظام کیا۔ اس میں کم و بیش چار سو اکابر علم شریک تھے۔ کیمبرج اور دوسرے مقامات سے بھی مختلف اصحاب آئے تھے۔ سر عبد القادر مرحوم، جو اس زمانے میں پریوی کونسل کے ممبر کی حیثیت میں لندن میں تھے، اس اجتماع کے صدر قرار پائے۔ ابتدائی تقریر ڈاکٹر نکلسن نے کی اور فرمایا کہ پچیس برس پیشتر کسی طالب کے متعلق یہ پیشگوئی کرنا مشکل تھا کہ وہ آگے چل کر عظمت کی بلندیوں پر پہنچے گا لیکن ۱۹۰۵ء میں اقبال کو دیکھ کر سعدی کا یہ شعر ذہن میں تازہ ہو جاتا تھا:

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

"اسرارِ خودی" شائع ہوئی تو میں ابتدا میں سمجھ گیا کہ اقبال دوسرا نٹشے ہے یا اس نے نٹشے کے خیالات کا چربہ اتارا ہے لیکن میں عمیق مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بالکل الگ تعلیم ہے۔ مولانا روم کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے جو کام شروع کیا ہے وہ "جہاد اکبر" ہے۔

ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک سپاس نامہ پڑھا گیا۔ خود حضرت مرحوم نے جوابی تقریر میں شکریے کے سوا جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

مجھے ۱۹۰۵ء میں احساس ہو چکا تھا کہ مشرقی ادبیات ظاہری دلکشیوں اور دل آویزیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لیے امید، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یورپی ادبیات میں ہمت افروزی کا جوہر نظر آتا تھا لیکن ان کا مقابلہ سائنس سے تھا۔ میں ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس گیا تو میرے دل میں ایک کش مکش بپا تھی کہ کیا کرنا چاہیے۔ یہ کشمکش ۱۹۱۰ء میں ختم ہوئی اور میں نے "اسرار خودی" کی ترتیب شروع کی۔

سائنس کے مقابلے میں یورپی ادبیات کی کمزوری کے احساس کو میں نے مختلف اشعار

ہیں واضح کیا ہے مثلاً :

عشق نا پید و خرد مے گزدش صورت مار
گرچہ دلہ کاسۂ زر لعل روانے دارد

آخر میں آپ حضرات کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو اپنے فرزند جاوید کو کی ہے :

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گرد خود گردندہ چوں پرکار باش

وہی بات دہراتا ہوں جو صوفیوں سے کہی ہے :

زمن گو صوفیان با صفا را
خدا جویانِ معنی آشنا را
غلام ہمت آں خود پرستم
کہ با نورِ خودی بیند خدا را

دوسرا اجتماع انڈیا سوسائٹی کی طرف سے ۸ ۔ نومبر کو ہوا ۔ اس کے صدر سر فرانسس ینگ ہسبینڈ تھے اس اجتماع میں حضرت علامہ نے اپنی شاعری کی سرسری کیفیت پیش کی ۔ تیسرا اجتماع کیمبرج میں ہوا ۔ اس میں پروفیسر سارلے نے پہلی تقریر کی اور کہا کہ طالب علم کے زمانے میں اقبال زیادہ بولتے نہ تھے بلکہ خاموش رہتے تھے ۔ ان کا خیال یہ تھا کہ لکچروں کے بجائے پروفیسروں کی پرائیویٹ صحبتیں زیادہ قیمتی ہوتی ہیں ۔ آج وہ شاعر اور حکیم کی حیثیت سے دنیا بھر میں مشہور ہیں ۔ حضرت علامہ نے جوابی تقریر میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کیمبرج بہت بڑا علمی ذخیرہ ہے جس نے یورپ کی تہذیب و تمدن کو بنانے میں نمایاں حصہ لیا ۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ ۔ یورپی تہذیب میں مذہب اور حکومت کی علیحدگی بڑی مصیبتوں کا باعث بنی ۔ میں نے جب اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو چند پیشگوئیاں کی تھیں جن کا مطلب اس وقت میں خود بھی نہیں سمجھا تھا لیکن ۱۹۰۶ء کی پیشگوئیاں ۱۹۱۴ء میں پوری ہوئیں ۔ اس

علیحدگی کے باعث قوموں میں جنگیں چھڑیں۔ تہذیب روح اخلاق سے محروم ہوئی اور اس کا رُخ دہریت کی طرف پھر گیا۔ بالشوزم اس کا طبعی نتیجہ ہے۔ آپ کو میری نصیحت یہ ہے کہ مادیت سے بچو۔ مذہب کی قدر و قیمت پہچانو۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ انگریز عورتوں کو بھی نصیحت کروں۔ انگریز عورتوں کو میری نصیحت یہ ہے کہ آیندہ نسل کو دہریت کے چنگل سے بچاؤ۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان)

۲۱۔اپریل ۱۹۵۲ء

کلامِ اقبال کا حقیقی مقام

(چند پیشگوئیاں)

اقبالؔ کے کلام میں چند پیشگوئیاں ہیں ، جو اس زمانے میں منظر عام پر آئی تھیں، جب ان کے مفہوم کا صحیح تصور بھی کسی دماغ میں نہ تھا۔ اس وقت انھیں شاید ہی کسی نے ایک شاعر کی خیال آرائی سے زیادہ وقعت دی ہو۔ ظاہری حالات میں بھی ان پیشگوئیوں کے لیے سازگاری کا کوئی پہلو موجود نہ تھا۔ تاہم جلد ہی وہ حقیقت ثابتہ کا لباس پہن کر منظر عام پر آگئیں۔ آج کوئی چاہے بھی تو ان کی صداقت سے انکار یا اختلاف نہیں کر سکتا۔ عجیب امر یہ ہے کہ پورا ہو جانے کے بعد بھی شاید ہی کسی کو ان کے رشتے باہم جوڑنے کا خیال آیا ہو۔

اقبالؔ کی روحانی حیثیت کے بارے میں میرا جو تصور ہے، اسے یہاں پیش نہیں کرنا چاہتا۔ ان پیشگوئیوں کے متعلق گفتگو کا مدعا بھی یہ نہیں کہ اقبالؔ کی روحانی و معنوی حیثیت کی چہرہ کشائی کروں۔ میں اپنی ناچیز بساط کے مطابق صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس مرحوم نے جو کچھ کہا ، وہ خیال آرائی اور شاعرانہ رنگ آمیزی کا مرقع نہ تھا۔ کم از کم مارچ ۱۹۰۷ء کے بعد انھوں نے جو کچھ فرمایا ، پیش آیند حقائق کے متعلق اس یقین و وثوق کی بنا پر فرمایا ، گویا وہ سب کچھ برای العین دیکھ رہے تھے۔ اس وقت سے ان کے فکر و تخیل کی پرواز حقیقت کی فضا میں رہی۔ ان کے کلام میں ایک غیر معمولی روشن ضمیری اور خداداد بصیرت کی تجلیاں شروع ہو گئیں۔ ان کی شاعری کا یہ مقام و مرتبہ پوری طرح ذہن نشین کر لینا لازم ہے۔

اقبالؔ کے کلام میں پیشگوئیوں کی ابتدائی جھلک میرے علم کی حد تک " بانگِ درا" کی

اس نظم میں نظر آتی ہے، جس کی پیشانی پر ذرا جلی حروف میں مرقوم ہے "مارچ ۱۹۰۷ء"۔ بظاہر یہ نظم کا عنوان نہ تھا، صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ نظم مارچ ۱۹۰۷ء میں کہی گئی تھی، جب اقبالؒ ولایت میں تھے۔ اس نظم کو ان کی شاعری میں ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت حاصل ہے، جس کے بعد ان کے کلام کا رنگ بالکل بدل گیا۔ گویا جس کلام کی نہایت "ارمغان حجاز" ہے، اس کی ابتدا حقیقتہً مارچ ۱۹۰۷ء میں ہوئی تھی۔

میرزا غالبؔ نے ایک مقام پر عین شعر گوئی کے وقت کی معنوی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

بنلیم از گداز دل، در جگر آتشے چو سیل
غالبؔ اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیر من بری

اس کی صحیح ترجمانی میں نہیں کر سکتا۔ الفاظ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اے مخاطب، اگر تو شعر گوئی کے وقت کسی طرح میرے ضمیر میں راہ پا سکے تو دیکھے گا کہ دل گھلا جا رہا ہے اور جگر میں آگ موجزن ہے، جس نے سیل کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔

اگر اقبالؔ پر بھی شعر گوئی کے وقت ایسی ہی کیفیت طاری ہوتی تھی تو میں نہیں کہہ سکتا دل میں جوش گداز اور جگر میں سیل آتش کی موجزنی کا کیا عالم ہوتا تھا۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں انھوں نے ۱۹۰۷ء کے بعد جو کچھ کہا، ان میں سے اکثر نظمیں ایسی ہیں، جن کی تاثیر بجلی کی تیز رو کی طرح ذہن و دماغ سے گزرتی ہوئی سیل آتش کے ساتھ قلب و روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور یہ سب کچھ قدرت کی خاص کارفرمائی کا ایسا کرشمہ ہے، جس کی حقیقت سے ہم عامی بالکل بے خبر ہیں۔

مارچ ۱۹۰۷ء والی نظم کے ابتدائی شعر یہ تھے:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خار زار ہو گا
سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

واضح رہے کہ ۱۹۰۷ء میں پوری اسلامی دنیا بے چارگی اور فرو ماندگی کی خوفناک کش مکش میں مبتلا تھی اور ظاہر بینوں کو صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمان زندگی کی بازی ہار رہے ہیں۔ تاہم اقبال کے اشعار کی روح بالکل مختلف تھی۔

غالباً سب نے اسے شاعرانہ تخیل طرازی سمجھا ہوگا۔ چونکہ اقبال ملت اسلامیہ کے مستقبل کی نسبت سراپا امید تھے اس لیے نقاش فکر نے ان کی ذہنی دنیا کے افق پر نگارخانۂ آرزو کا ایک دل پذیر نقشہ کھینچ دیا، جسے انھوں نے شعر کا لباس پہنا دیا۔ میں ان شعروں کے باب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آگے چل کر اصلیت خود بخود آشکارا ہو جائے گی۔

اسی نظم میں اقبال نے اہل مغرب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپایدار ہو گا

ان شعروں میں وثوق و اعتماد کی جو روح برابر رقصاں ہے، محتاج بیان نہیں غور فرمائیں کہ آیا ۱۹۰۷ء میں ایسی کوئی بات زبان پر لانے کے لیے کچھ بھی گنجایش موجود تھی؟ اس وقت تہذیب فرنگ کی ظاہری درخشانیوں سے زمانے بھر کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں —

یورپی سامراج کا آٹھ ڈنکوں والا بحری عفریت یعنی "اوکٹوپس" اپنے زہریلے نیش روئے زمین کے بیشتر ملکوں اور اکثر اسلامی خطوں کے قلب وجگر میں چبھوئے بیٹھا تھا۔ اہل فرنگ کی طاقت وقوت اور دولت وثروت کے سامنے ایشیا اور افریقہ کی پوری دنیا عاجز، مجبور اور بے بس تھی۔

یہ نظم "مخزن" میں شائع ہوگئی تھی۔ مگر مجھے یقین ہے، کسی کو بھی احساس نہ ہوا ہوگا کہ یہ ایک غیر معمولی نظم ہے، جس میں آنے والے دور کا نقشہ قبل از وقت پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ گمان تو کسی کو بھی نہ گزرا ہوگا کہ اقبال ایک ایسی حقیقت بیان کر گئے ہیں، جس کی شہادت اور تصدیق کے ڈنکے کچھ عرصہ بعد کائنات کے گوشے گوشے میں بجیں گے اور یورپی تہذیب واقعی اپنے خنجر سے اپنا گلا کاٹ ڈالے گی۔

موجودہ صدی کا دوسرا عشرہ شروع ہوا تو عالم اسلام کی فضا یاس ونومیدی کے بادلوں سے مزید تیرہ وتار ہوگئی۔ یورپی سامراجیوں کی سازشیں تیز تر ہوگئیں۔ پہلے اٹلی سے طرابلس پر حملہ کرایا گیا، جسے آج کل لیبیا کہتے ہیں۔ پھر تمام بلقانی ریاستوں کو اٹھا کر سلطنت عثمانیہ کے قلب پر ہلہ بول دیا گیا۔ مغرب بعید سے مشرق بعید تک کوئی بھی اسلامی خطہ نہ تھا، جو تسلط اغیار کی زنجیروں میں کم یا زیادہ جکڑ نہ لیا گیا ہو۔ یہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کی حالت ہے لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ اقبال نے ۱۹۱۲ء میں "شمع اور شاعر" انجمن حمایت اسلام کے سٹیج پر پڑھی تھی اور اس تاریک دور میں مسلمانوں کو درخشاں مستقبل کا ولولہ افروز پیغام دیا تھا، جس کا حرف حرف یقین واعتماد سے لبریز تھا؟ یعنی

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبلم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوتِ رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

"شمع اور شاعر" خود اقبال کی زبان سے ہزاروں نے سُنی اور لاکھوں نے پڑھی۔ مگر کیا ۱۹۱۲ء میں کسی کو یقین آسکتا تھا کہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے، یہ ہو کے رہے گا؟ یعنی یورپی تہذیب کا انجام خودکشی کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور اس کام کے لیے بھی وُہ اپنا خنجر استعمال کرے گی اور مسلمان پھر عروج کی بہاریں دیکھیں گے؟

تاہم دیکھیے، صرف دو ہی سال گزرے تھے کہ پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ ستمبر ۱۹۱۴ء سے نومبر ۱۹۱۸ء تک یورپ کے جسم پر خودکشی کے خنجر سے مہلک چرکے لگتے رہے۔ اس کی جن آبادیوں کو جنت نظیر سمجھا جاتا تھا، وہ ہولناک تباہ کاریوں اور خونریزیوں کی جولاں گاہ بن گئیں۔ واقعی صیاد کے حلق سے دلدوز نالے بلند ہوتے رہے۔ واقعی گلچیں کے خون سے کلیوں کے لیے رنگین قبائی کا وافر سامان فراہم ہو گیا۔ روسی سامراج کا تار و پود اسی جنگ میں بکھرا۔ البتہ برطانیہ اور فرانس کی قوت بظاہر اوجِ کمال پر پہنچ گئی۔ ان طاقتوں نے عرب کے بھی حصّے بخرے کر کے اپنے دامن بھر لیے۔ اس وقت تک رفتار دریا کی سطوت کا "مآل" پردۂ غیب میں تھا اور معلوم نہ تھا کہ "موج مضطر" کب اور کیونکر زنجیر پا بنے گی۔

ان حالات کے باوجود اقبال کا یقین ایک محکم چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم و استوار تھا چنانچہ "شمع اور شاعر" کے پیغام امید کی یاد تازہ کراتے ہوئے "خضرِ راہ" میں فرمایا:

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر کسے خیال ہو سکتا تھا کہ برطانیہ اور فرانس کے سامراج بھی ریت کے گھروندے ہیں اور آنے والے سیل حوادث میں یہ بالکل ناپید ہو جائیں گے ؛ دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۱۲ء کی پیشگوئیاں نور کی موجیں بن کر افق خاور پہ ابھرنے لگیں۔

۱۔ افغانستان اچانک خواب غفلت سے بیدار ہوا اور اس نے ایک ہی جست میں آزادی کامل حاصل کر لی۔

۲۔ ایران قرنوں سے بے چارگی کی خاک پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اس کی رگوں میں دفعتہً تازہ خون دوڑنے لگا اور نئی زندگی کے آثار بروے کار آ گئے۔

۳۔ مصر کو ۱۸۸۲ء میں برطانوی اقتدار کی زنجیریں پہنائی گئی تھیں۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد وہاں تحریک آزادی نے ایسے زبردست زلزلے کی شکل اختیار کر لی، جس نے برطانوی حصار اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔

۴۔ پاک و ہند میں تحریک حریت سے ایک بے پناہ طوفان بپا ہوا جس کی کوئی مثال برطانوی سامراج کی سرگزشت میں موجود نہ تھی اور حقیقتہً یہی تحریک ۱۹۴۷ء کی آزادی کا مقدمہ ثابت ہوئی۔

۵۔ مغرب بعید میں غازی محمد بن عبدالکریم نے بے سروسامانی کے باوصف ہم قوموں کو منظم کر کے فرانس و ہسپانیہ دونوں کا وقار خاک میں ملا دیا۔

۶۔ سب سے آخر میں مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ غازی مصطفیٰ کمال اور ان کے مجاہد رفیقوں نے یورپی سامراجیوں کے تمام معاندانہ منصوبے میدان سقاریہ میں بہ نوک شمشیر مکڑی کے جالے کی طرح بکھیر کر رکھ دیے۔

صاف نظر آنے لگا کہ برطانیہ اور فرانس کی فاتحیت محض ایک سراب اور سراسر فریب نظر تھی۔

یہ مارچ ۱۹۰۰ء کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا آغاز تھا اور اس بشارت عظمیٰ کی تمہید تکمیل جو اقبالؔ نے ۱۹۱۲ء میں دی تھی۔ "خضرِ راہ" میں اس مرحوم نے پھر فرمایا:

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دُھندلی سی اک تصویر دیکھ

علمدارانِ توحید یقیناً حرکت میں آ گئے تھے۔ ان کے پرچم، امید کی روشن فضا میں اڑ رہے تھے۔ تاہم منزل مقصود کے چراغ نگاہوں سے اوجھل تھے اور تہذیب فرنگ کی خودکشی کے عبرت افزا نظارے کو آنکھیں ترس رہی تھیں۔ عین اس وقت اقبالؔ نے ایک اور پیشگوئی کر دی جو بالآخر ۱۹۰۰ء کی پیشگوئی کے لیئے تکمیل کا آخری وسیلہ بنی۔ فرمایا:

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

"خضرِ راہ" ہزاروں نے سنی، لاکھوں بلکہ کروڑوں نے پڑھی، مگر کسی کو بھی احساس نہ ہوا کہ اقبالؔ کی پیشگوئی کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟ "آزمودہ فتنہ" کیا شکل اختیار کرے گا؟ اس کی کارفرمائی کا دور کب شروع ہوگا؟ حالانکہ انھوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس فتنے کی روک تھام کے لیے تمام تدبیریں رسوا ہو کر رہ جائیں گی اور کارگاہ قضا و قدر کا فیصلہ ضرور نافذ ہوگا۔

اس "آزمودہ فتنے" نے دوسری عالمی جنگ کی شکل اختیار کی جو ستمبر ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی۔ بظاہر اس کا ذمہ دار ہٹلر تھا، جس کی ابتدائی سرپرستی عام روایت کے مطابق

برطانیہ اور امریکہ نے کی تھی جو یورپی مدبر اور دانشور قرنوں تک اقوام عالم کی تقدیروں کے فیصلے کرتے رہے تھے، انھوں نے ہٹلر کو جنگ سے باز رکھنے کے لیے جتنی تدبیریں اختیار کیں، وہ بداہتہً عقل سلیم کے خلاف تھیں، لہٰذا نہ محض ایک ایک کرکے ناکام و رسوا ہوئیں، بلکہ اصل فتنے کو تیزی سے قریب تر لاتی گئیں۔ واقعی قضا و قدر کا فرمان ٹل نہیں سکتا تھا۔

آخر آگ اور خون کے سیل کا بند ٹوٹا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک محض یورپ ہی نہیں بلکہ دوسرے خطے، جزیرے، سمندر، صحرا اور پہاڑ بھی اس سیل کی لپیٹ میں آئے۔ ایک قیامت تھی، جس کی بجلیاں پانچ سال تک روئے زمین کے مختلف خطوں پر کوندتی اور گرتی رہیں۔ مغربی سامراج کی گردن اس کے اپنے ہی خنجر سے کٹ گئی۔ جن سلطنتوں کا سرمایہ افتخار یہ تھا کہ ان پر آفتاب غروب نہیں ہوتا، آج ان کا سراغ لگانے کے لیے سورج کی قندیل بھی کچھ کام نہیں دے سکتی۔

اقبال نے "جواب شکوہ" میں ملت اسلامیہ کو خدا کی زبان سے پیغام دیا تھا:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

پھر اس اسم پاک کی ہمہ گیری و کائنات آرائی کا ذکر فرماتے ہوئے اسلامی افریقہ کے متعلق کہا تھا:

مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دنیا — وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیٔ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا — عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

"جاوید نامہ" کا دور آیا تو "درویش سودانی" کی زبان سے پورے افریقہ کو مخاطب کرکے کہا:

اے جہان مومناں مشک فام
از تو می آید مرا بوے دوام
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر
تا کجا تقدیر تو در دستِ غیر
بر مقام خود نیائی تا بکے
استخوانم دریمے نالد چو نے

آج "مومناں مشک فام" کا جہان آزاد ہے۔ افریقیوں کے پاس فرنگستانیوں سے لڑنے کے لیے کوئی قابلِ ذکر سامان موجود نہ تھا، لیکن دیکھیے وقت آیا تو شکاری خود جال اٹھا کر نکل گئے اور افریقیوں کی عنان تقدیر غیروں کے ہاتھ سے نکل کر خود ان کے ہاتھ آگئی۔

یہ نومولود قوتیں طبعی بالیدگی کے بعد کارفرمائی کے کیا کیا جوہر دکھائیں گی؛ ان کے بارے میں قبل از وقت کیا کہا جا سکتا:

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اگر میری برہنہ گوئی گراں نہ گزرے تو ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اقبال کی ایک پیشگوئی اب تک منتظرِ تکمیل ہے اور اس کی ذمہ داری خود ہماری حقیقت ناشناسی، بے اندامی اور اعمالِ حسنہ میں انتہائی فروپایگی پر عائد ہوتی ہے۔ میں نے "شمع اور شاعر" کے جو شعر پہلے سنائے تھے ان میں سے اس پیشگوئی کو عمداً الگ کر لیا تھا، یعنی:

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

حرم پاک اور سجدوں کے لیے زبانوں کی طراری و تیزی اور شور و غوغا کی محشر خیزی میں تو کلام کی گنجایش نہیں لیکن اقبال کی مراد جن سجدوں اور حرم سے تھی، ان کی جھلک

تو اب تک کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے کیا تو ہم سجدوں کی حقیقی حیثیت سے بہرہ مند نہیں ہوئے اور محض ریا و نمایش کے انداز میں پیشانی زمین پر رکھ دینے کو "سجدہ" سمجھے بیٹھے ہیں یا پھر حرم پاک ہمارا منتہاے مقصود نہیں رہا، حالانکہ اقبالؔ نے واشگاف طریق پر کہہ دیا تھا کہ:

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

یہی وجہ ہے کہ رفعت و برتری کے ظاہری اسباب کی فراوانی کے باوصف ہم ان برکات وحسنات سے کاملاً تہی دامن ہیں، جن کی خاطر قدرت نے یہ سامان عطا کیے۔ سفر بقدر ضرورت نقل وحرکت کا متقاضی ہے اور بیماری کے دُور ہونے کی اُمید کا انحصار طبیبوں کی مجوزہ دوائیں پینے پر ہے۔ محض سفر سفر کی رٹ لگا کر آج تک کون سی منزل طے ہوئی ہے اور بیماروں کو محض نسخے زور زور سے سنا کر کس نے شفا کی امید رکھی ہے؟ ہم امتحان کی منزل میں ہیں۔ اس کے لیے دلی تڑپ سے تیار ہو کر اور ہر متاع ہمت ساتھ لے کر میدانِ عمل میں آیئے۔ یاد رکھیے کہ ہماری ترقی کا معیار یہ سامان نہیں، جن کی ڈینگیں رات دن ہماری زبانوں پر رہتی ہیں۔ ہم سے بدرجہا فراوان سامان مغربیوں کے پاس تھے، لیکن ان کی ترقی یا استحکام کا معیار ثابت نہ ہوئے۔ ہماری دنیوی فلاح اور اخروی نجات اس پیغامِ حق کی حقیقی، پُرخلوص اور مکمل پیروی پر موقوف ہے، جو کائنات انسانیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک سے ملا تھا۔ عقل سلیم اور تجربہ گاہ تاریخ دونوں اس کے مصدّق ہیں:

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

"اوراق"۔ لاہور
نومبر ۱۹۶۸ء

علامہ اقبالؒ کا نظریۂ حیات

عنوانِ بالا کے تحت ہفت روزہ چٹان لاہور کے ۲۱ اپریل ۱۹۵۸ء کے شمارے میں عزیز زبیدی صاحب کے نام چند اصحاب علم و فکر کے خطوط شائع ہوئے۔ مولانا غلام رسول مہر کا مکتوب مندرجہ ذیل وہیں سے نقل کیا گیا ہے۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۳ء

مکرمی۔

میں ۱۷ مارچ کو سندھ چلا گیا تھا۔ کل واپس آیا تو گرامی نامے کے مطالعے سے مشرف ہوا۔ عرض جواب میں جتنی بھی تاخیر ہوئی میری غیر حاضری کی وجہ سے ہوئی۔ آپ کے استفسار کے جواب میں صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ حضرت علامہ مرحوم کی زبان مبارک سے تعین کے ساتھ کبھی کچھ نہ سنا اور نہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سولہ برس کی طویل مدت ان کے ساتھ گہری وابستگی میں گزری۔ اس مدت کے جتنے اوقات ان کی خدمت میں بسر کیے وہ آج تک کسی بزرگ ہستی کے ساتھ بسر نہیں ہوئے۔

لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ حدیثوں کو اسی طرح مانتے تھے جس طرح عام مسلمان مانتے ہیں۔ روایات کی صحت کو پرکھنے کے جو اصول محدثین نے وضع کیے ان کی تعریف و ستائش بارہا علامہ مرحوم کی زبان سے سنی بلکہ میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو کئی مرتبہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم آج تک ایسا یگانہ کارنامہ پیش نہیں کر سکی۔ ان کے خطوں میں بھی غالباً احادیث سے استدلال کے شواہد مل جائیں۔ اتنا تو مجھے یاد ہے کہ کئی مرتبہ انہوں نے فرمایا کہ فلاں حدیث کے درجے کی تحقیق کرنی چاہیے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ وہی کہہ سکتا ہے جو حدیثوں کا معتقد ہو۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے :۔

جیراج پوری اور پرویزی مکاتیبِ فکر کے در و دیوار سے یہ صدائیں اُٹھ رہی ہیں کہ حضرت علامہ اقبال احادیثِ رسولؐ کو تاریخ اور معاملات سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے ہیں، میری ناچیز رائے میں اگر کوئی شخص اتنا مان لے تو پھر چنداں بحث کی ضرورت نہیں رہتی، احادیث کی حقیقی حیثیت یقیناً تاریخی ہے، یعنی وہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و افعال کا ریکارڈ ہیں۔ اس ریکارڈ کے مختلف حصّوں کی صحت و عدم صحت کو محکم و مُسلم اُصولِ امتحان کی بنا پر جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے لیکن جب کسی ارشاد یا عمل کے باب میں ثابت ہو جائے کہ وہ صحیح ہے تو پھر اس کی حیثیت عام تاریخی ریکارڈ کی نہیں رہے گی بلکہ وہ اس ذاتِ پاک کے ارشاد یا عمل کا ریکارڈ ہو گا جس پر قرآنِ مجید نازل ہوا، جس کے نمونۂ عمل کو قرآن مجید نے "اسوۂ حسنہ" فرمایا، جو دین کے بارے میں ہدایت و راہنمائی کا واحد سرچشمہ ہے۔ اور جس کے ارشاد و عمل کا اتباع دین داری کی لازمی شرط ہے۔ پس یہاں پہنچتے ہی وہ تاریخی ریکارڈ جزو دین اور مثبت احکامِ دینیہ بن جاتا ہے۔ غرض صحت و عدم صحتِ روایات کے بارے میں اصول کی بنا پر بحثیں ہو سکتی ہیں۔ مختلف روایات کی تاویل بھی ذہن میں آسکتی ہے۔ لیکن بعد ثبوتِ صحت اس کو عام تاریخی ریکارڈ سمجھنا اور حاملِ وحی کے ارشاد و عمل کے ریکارڈ کی حیثیت میں واجب الاتباع نہ جاننا میرے نزدیک ہٹ دھرمی ہے اور مسلّمات سے اساسی انحراف۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دُوں کہ حضرت علامہ مرحوم نے اپنی زندگی کے کسی دور میں محدث یا فقیہ یا امام ہونے کا دعویٰ نہیں فرمایا کہ ہم خالص دینی معاملات میں ان کے کسی نظریے کو مدارِ اتباع بنا لیں۔ خُدا نے اپنے فضلِ خاص سے ان کو حقائقِ حیاتِ ملّی و اسلامی کا علم بخشا تھا۔ ان حقائق سے ہم رُوحِ اسلامی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ وہ جو کچھ فرما گئے یا جو کچھ مختلف اصحاب ان سے منسوب کرتے ہیں، ہم اس کی صحت کو صرف اس لیے اٹل مان لیں کہ وہ حضرت علامہ مرحوم کا ارشاد تھا یا کسی انتساب کی صحت و تندرستی کی جستجو اس غرض سے کریں کہ

بہ شرطِ اثباتِ صحت ہم اس کی پیروی کریں گے۔ یہ شرف اس کائنات میں آخری و اکمل صورت میں صرف حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہوا اور قیامت تک اسی ذاتِ پاک کے لیے مخصوص رہے گا۔

آپ میری رائے شائع کرانا چاہیں تو شوق سے فرمائیں لیکن اس حد تک کہ :۔

(۱) میں نے سولہ برس کی مدت میں حضرت علامہ مرحوم کی زبان سے کبھی ایسی بات نہ سنی جس سے یہ سمجھا جا سکتا کہ احادیث کے بارے میں ان کا عقیدہ عام مسلمانوں کے عقیدے سے متفاوت ہے۔

(۲) ان کی گفتگوؤں سے یہی سمجھتا رہا کہ وہ احادیث کی دینی حیثیت کے معتقد ہیں۔

(۳) تعین کے ساتھ اس بارے میں ان سے کبھی سوال نہ کیا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

یہ آپ کے سوال کا جواب ہے باقی جو کچھ عرض کیا ہے وہ میری ذاتی گزارشیں ہیں۔ .....

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

نیازمند

مہر

چٹان عید نمبر ۲۱ اپریل ۱۹۵۸ء

علّامہ اقبالؒ اور افریقہ کی آزادی

اقبال کی تعلیم پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب بادی النظر میں کسی نئے موضوع کا خیال نہیں آسکتا لیکن غور و امعان سے کام لیا جائے تو اب بھی کئی عنوان ایسے مل جائیں گے جن سے اعتنا کی کوئی مثال کم از کم میں نے نہیں دیکھی۔

اقبال کی مختلف نظموں کے درمیان گہرا تعلق ہے اگرچہ وہ مختلف حالات میں کہی گئیں ان میں زمانی فصل بھی تھا اور سب کے تقاضے بھی یکساں نہ تھے۔ خوب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں۔ ہر کڑی ماحول کی مناسبت کے سانچے میں ڈھل کر نظم کی صورت میں منظر عام پر آتی رہی لیکن وہ زنجیر کا ایک لاینفک جزو تھی اور جہاں نمودار ہوئی وہی اس کا اصل مقام تھا۔

فرنگی استیلا کا انجام

مثلاً "شمع اور شاعر" ۱۹۱۲ء میں کہی گئی تھی اس کا آخری بند متعدد پیشگوئیوں پر مشتمل تھا ان میں سے ایک پیشگوئی کا تعلق فرنگی قوت کے استیلاء سے تھا جو ۱۹۱۲ء میں انتہائی عروج پر پہنچا ہوا تھا اور کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ استیلا بہت تھوڑی مدت کے اندر داخلی تصادم سے اپنی بنیادیں کھوکھلی کر لے گا۔

اقبالؒ نے ۱۹۱۲ء میں کہا تھا:

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

آٹھ نو سال بعد "خضر راہ" میں اس پیش گوئی کا کم از کم ایک حصہ واضح طور پر پورا ہو گیا تو فرمایا:

تُو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

پہلی نظم اور دوسری نظم میں خاصا زمانی فصل ہے۔ پھر دونوں کے موضوع الگ ہیں۔ مسائل و مباحث جدا ہیں۔ بصیرتیں اور موعظتیں مختلف ہیں۔ تاہم ان کی معنویت میں ربط و تعلق کے شواہد بھی بالکل واضح ہیں۔ یہ بھی کلامِ اقبال کی ایک خصوصیت ہے جس میں وہ دُوسرے شعرا سے ممتاز ہیں۔ میرے محدود علم کے مطابق اب تک اس پہلو پر کوئی کام نہیں ہُوا۔

مشرق کی نجات کا راستہ "خضرِ راہ" ہی کے ایک بند میں فرمایا تھا:

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر اسی بند میں انھوں نے "ربط و ضبطِ ملتِ بیضا" کے چند اہم اور بنیادی اصول بھی پیش کر دیے تھے مثلاً:

۱۔ ٹوٹے ہُوئے اجزا کو جوڑنے کی غرض سے کسی قسم کے سامنے مومیائی کی بھیک کے لیے دستِ سوال دراز نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ عام سیاست کو چھوڑ کر دین کو مدار و مسلک بنانا لازم ہے جو اصل شے ہے۔ ملک و دولت بجائے خود مقصود نہیں یہ چیزیں تو حرم مقدس کی حفاظت و پاسبانی کا ثمرہ ہیں۔

۳۔ تمام مسلمانوں کو حرم کی حفاظت کے لیے متحد ہو کر "بنیان مرصوص" کی شکل اختیار کر لینا چاہیے۔

۴۔ جو مسلمان رنگ و خوں کے امتیازات میں مبتلا ہوں گے وُہ مٹ جائیں گے خواہ ان کا تعلق کسی قوم سے ہو۔

۵۔ اگر مسلمانوں نے نسل کو دین پر مقدم کر لیا تو وُہ راستے کے غبار کی طرح اڑ کر فنا

ہو جائیں گے۔

۶۔ خلافت کی بنیاد استوار کرنے کے لیے اسلاف کا سا قلب و جگر پیدا کرنا چاہیے۔

۷۔ فرقہ بندیوں کے امتیازات سے بالکل کنارہ کش ہو جانا لازم ہے۔

تعلیم کی پیروی کا تقاضا

یہ موضوع خاص توجہ کا محتاج تھا اور ایسے متعدد موضوع کلام اقبال میں موجود ہیں۔ ٹھنڈے دل سے سوچنا اور غور کرنا ضروری ہے کہ ملت بیضا کے ربط و ضبط پر کیوں مشرق کی نجات موقوف ہے؟ خود اس ربط و ضبط کے لیے سچی تڑپ کے تقاضے کیا ہیں اور ان تقاضوں کو کیوں کر پورا کیا جا سکتا ہے؟ آیا چند عناصر کی کج روی یا غلط اندیشی پر زبان طعن دراز کر کے ہم اس عزیز ترین نصب العین سے قریب تر ہو سکتے ہیں؟ یا آیا چند اسلامی ملکوں کا بعض مقاصد کے لیے تعاون پر آمادہ ہو جانا وہی "ربط و ضبط ملت بیضا" ہے جس کی دعوت اقبال نے دی تھی اگرچہ اس تعاون کی وضع و ہیئت بالکل دوسری ہو اور اس کے مقاصد بھی دوسرے ہوں۔

کسی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی صحیح شکل یہ ہے کہ اخلاص و بے غرضی سے والہانہ طریق پر کام کیا جائے یہ نہیں کہ ہم اصل تعلیم کی روح و معنویت سے آنکھیں بند کر کے اس کے خلعت موزوں کو اپنے "قامت ناساز و بے اندام" پر آراستہ کرنے کی سعی میں مصروف ہو جائیں۔ یہ اس تعلیم پر بھی ظلم ہے اور اپنے اوپر بھی اسے ظلم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

افریقہ کی آزادی

یہ اور اس نوع کے دوسرے موضوع بھی غور طلب ہیں لیکن میں آج ایک اور موضوع کے متعلق چند گزارشیں پیش کرنا چاہتا ہوں یعنی افریقہ کی آزادی۔

جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں اقبال کو بہت پہلے سے افریقہ کی آزادی کا احساس تھا

اور اس مسئلے پر انھیں اظہارِ خیال کا موقع پہلے پہل طرابلس کے سلسلے میں ملا۔
"جوابِ شکوہ" کے آخر میں مسلمان سے فرماتے ہیں:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کردے

پھر اس اسمِ مبارک کی وسعت، ہمہ گیری اور آفاقیت کی توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شان "رفعنا لک ذکرک" دیکھے

قرآن مجید میں "رفعنا لک ذکرک" (ہم نے بلند کیا مذکور تیرا) کی بشارت موجود ہے۔ ہر سچے مسلمان کا ایمان یہی ہے کہ یہ بشارت پوری ہو کر رہے گی، خواہ ظاہری حالات کتنے ہی ناسازگار نظر آئیں اور خواہ ہم اپنی نالائقی اور نازیبائی کے باعث اس کی تکمیل میں حصہ داری اور ثواب کے مستحق قرار نہ پائیں۔ اس سلسلے میں اقبالؒ نے افریقہ کا ذکر کیا۔ فرماتے ہیں:

مردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دنیا — وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیِ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا — عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

بلاشبہ اس میں اولین مقصود افریقہ کے مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی سے عشق و محبت کی حرارت لے کر پارے کی طرح تڑپ رہے ہیں لیکن یہ کیوں کر ممکن تھا کہ مسلمانوں کی کوئی حرکت، آزادی کی کوئی جدوجہد، اغیار کے چنگل استبداد سے نجات کی کوئی تحریک پورے افریقی برّاعظم میں آزادی کا ولولہ و جوش

پیدا نہ کر دیتی؛ کیوں کر ممکن تھا کہ فرنگی استیلا کے جو آہنی حلقے ایشیا میں ٹوٹنے والے تھے وہ افریقہ میں بدستور قائم و استوار رہتے؛

یہ ۱۹۱۲ء میں کہا گیا تھا جب افریقہ کے ایک مختصر سے حصّے کو چھوڑ کر، جہاں مسلمان آباد تھے، ہر جگہ شہر خموشاں کا سا سکوت طاری تھا۔

فرعون کبیر اور فرعون صغیر

یہ آرزو اقبالؔ کے دل و دماغ میں برابر پرورش پاتی رہی۔ انھوں نے جب فرمایا تھا کہ مشرق کی نجات ربط و ضبط ملت بیضا ہے تو اس مشرق میں براعظم ایشیا کی طرح براعظم افریقہ بھی شامل تھا۔ یقیناً افریقہ کی آزادی کا دروازہ بھی مسلمانوں ہی کی جد و جہد سے کھلا۔ اس کی زنجیر ہائے محکومی بھی مسلمانوں ہی کی بے مثال قربانیوں سے پارہ پارہ ہونے لگیں۔

"جاوید نامہ" ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان لکھا گیا تھا۔ اس میں فلک زہرہ کی سیر کرتے ہوئے "خدایان اقوام قدیم" کی مجلس اور "نغمہ بعل" کے بعد فرعون و کچنر کی روحیں نمودار ہوتی ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ یہ لوگ "سرکش" اور "زور مست" تھے غائب کے منکر اور صرف حاضر کی پرستش کرنے والے تھے۔ ان میں سے ایک یعنی فرعون کا تعلق مشرق سے تھا اور دوسرے یعنی کچنر کا مغرب ہے۔

آں یکے بر گردنش چوبِ کلیم
واں دگر از تیغِ درویشے دونیم
ہر دو فرعون ایں صغیر و آں کبیر
ہر دو در آغوشِ دریا تشنہ میر
ہر کسے با تلخیِ مرگ آشناست
مرگِ جباراں ز آیاتِ خداست

یعنی فرعون کی گردن پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ضرب لگی، کچنر کو سید محمد احمد درویش

سودان کی تیغ نے دو ٹکڑے کر دیا۔ ایک بڑا فرعون تھا دوسرا چھوٹا فرعون۔ دونوں سمندر میں ڈوب کر مرے۔ موت کی تلخی سے سب کو سابقہ پڑتا ہے لیکن جبّاروں کی موت اللہ تعالیٰ کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔

ضمناً اپنا پیغام بھی پہنچاتے جاتے ہیں اس لیے کہ اصل مقصود داستان سرائی نہیں دعوت و موعظت ہے کہ "نورِ جاں" کے بغیر حکمرانی خام ہے۔ یدِ بیضا پاس نہ ہو تو بادشاہی کو حرام سمجھنا چاہیے۔ جس حکومت کا مدعا رقمیں وصول کرنا ہو، جو فوج اور قید و بند کی بنا پر قایم ہو، وہ رہزن ہے۔ اصل حکمران وہ ہے جو اس قسم کے تمام سامانوں سے بے نیاز ہو اور دلوں کے دروازے رضاکارانہ اس کے لیے وا ہو جائیں۔

اس سلسلے میں سید محمد احمد درویش سودانی کی روح آتی ہے اور کہتی ہے کہ اے کچز، آنکھ ہے تو دیکھ لے۔ تو نے ایک درویش کی قبر پامال کرائی تھی دیکھ اس کی خاک نے کیسا بدلہ لیا۔

آسمان خاکِ ترا گورے نہ داد
مرقدے جز دریمِ شورے نہ داد

آسمان نے تیرے لیے خشکی پر قبر نہ بننے دی اور تو سمندر کی آغوش میں دفن ہوا۔

مشک فام مومنوں کی دنیا

پھر سودانی درویش یعنی سید محمد احمد روحِ عرب کو بیداری کا پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں تو پھر اپنے اسلاف کرام کی طرح نئے دوروں کی خالق بن۔ اس وقت مصر پر فواد حکمران تھا۔ عراق پر فیصل اول اور دولت سعودیہ پر عبدالعزیز ثانی۔ سید محمد احمد کی روح ان تینوں سے کہتی ہے کہ دھوئیں کی طرح کب تک اپنے اوپر پیچ و تاب کھاتے رہو گے؟ اپنے سینوں میں وہ سوز پیدا کرو جو جا چکا ہے۔ دنیا میں وہ دور واپس لاؤ جو رخصت ہو چکا ہے۔ بطحا کی سرزمین مقدس! تجھ میں سے پھر کوئی خالدؓ پیدا ہو اور توحید کا نغمہ سنائے۔ تیرے

صحرا میں کھجور کے درخت اس سے بھی زیادہ بلند و برتر ہوں۔ کیا تجھ میں سے پھر کوئی فاروق نہ اٹھے گا؟

بالآخر وہ روح افریقہ کو یوں خطاب کرتی ہے:

اے جہانِ مومنانِ مشک فام
از تو می آید مرا بوے دوام
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر
تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر
بر مقامِ خود نیائی تا بکے
استخوانم در یمے نالد چو نے
از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰؐ است
مرد را روز بلا روزِ صفا ست

اے مشک جیسے چہروں والے مومنوں کی دنیا، یعنی اے افریقہ مجھے تیرے اندر سے دوام کی خوشبو آرہی ہے آخر تو کب تک ذوق سیر کے بغیر زندگی گزارے گی؟ کب تک تیری تقدیر غیروں کے قبضے میں رہے گی؟ تو کب تک اپنے اصل مقام پر نہ پہنچے گی؟ میری ہڈیاں نے کی طرح وقف فریاد و فغاں ہیں۔ کیا تو مصیبتوں اور بلاؤں سے ڈرتی ہے؟ آہ! تجھے رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد یاد نہیں کہ مرد کے لیے بلاؤں اور مصیبتوں کا دن گناہوں اور خطاؤں سے پاک صاف ہونے کا دن ہے؟"

اس دعوت کا رخ افریقی مسلمانوں کی طرف ہے لیکن حقیقت میں یہ پورے افریقہ کے لیے آزادی اور تصرف اغیار سے نجات کی دعوت ہے۔ سوڈانی درویش کو آج سے تیس بتیس سال پیشتر جس افریقہ سے "بوے دوام" ملی تھی وہ افریقہ آج انتہائی سرگرمی اور جوش و ہمت سے آزادی کی طرف دوڑا جارہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ پانچ

سال میں یہ برّاعظم کہاں پہنچ جائے گا اور مشرق و مغرب کی قوتوں کا توازن کیا شکل اختیار کرے گا ؟

دورِ حاضر کے فرعون

فرعون ہر دور میں موجود رہے اور آج بھی موجود ہیں۔ فرانس نے الجزائر کے تعلق میں فرعونیت کا چولا پہن رکھا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ الجزائر کو آزادی نہیں دی جاتی ؟ کیوں کہا جاتا ہے کہ اگر الجزائر فرانس سے اتحاد پر راضی نہ ہوا تو اسے تقسیم کر دیا جائے گا ؟ کیا دس لاکھ اجنبیوں کی خاطر ایک کروڑ باشندوں کی تقدیر کو معرضِ گردش میں رکھنا فرعونیت نہیں[1] ؟ فرعونیت کا انجام کس سے مخفی ہے ؟ اوراقِ تاریخ کی گواہی یہی ہے کہ جس نے مظلم کیا، جس نے حق و انصاف کے تقاضے پس پشت ڈالے، جس نے خلقِ خدا کے طبعی حقوق کی نگہداشت میں کوتاہی سے کام لیا اس پر خود اس کے عمل کا وبال بجلی بن کر گرا۔ چالیس پینتالیس سال کی مدّت میں فرانس کو دو مرتبہ پاداشِ عمل سے سابقہ پڑ چکا ہے اور ۱۹۴۰ء کی ذلت کے داغ تو ڈیگال جیسے چار کروڑ فرانسیسیوں کے آنسو بھی نہیں دھو سکتے لیکن غفلت کی سرگشتگی اور حق ناشناسی کے جمود کا یہ عالم ہے کہ جب کسی کو ذرا کمزور دیکھا، جابرانہ طریقِ عمل اختیار کر لیا جن لوگوں کے دل حق و انصاف سے خالی ہو جاتے ہیں وہ ہر مسئلے کو ذاتی اغراض کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ الجزائر کی آزادی ایک ایسے ملک کی آزادی ہے جو ایک سو تیس برس سے فرانس کے ظلم و جور کا شکار چلا آتا ہے۔ اگر اس مدّت میں وہاں چند لاکھ فرانسیسی یا دوسرے فرنگی جا بسے ہیں تو اس سے اصل مسئلے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے ؟ ان فرنگیوں کے لیے دو راستے ہیں ایک یہ کہ الجزائر کی قومیت قبول کریں اور وہاں رہیں۔ دوسرا یہ کہ الجزائر کو چھوڑیں اور اپنے اپنے ملکوں میں چلے جائیں تیسرا راستہ کوئی نہیں۔

---

[1] یہ مقالہ آزادی الجزائر سے پہلے لکھا گیا تھا۔

صحرائی علاقہ بھی الجزائر کا حصّہ ہے اگر اس میں سے تیل نکل آیا ہے تو اس کا نتیجہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اسے فرانس کے قبضے میں چھوڑ دیا جائے ؟ فرانس کے جو ہمدرد معاون اور ساتھی اس باب میں اعلان حق سے گریزاں ہیں چپ بیٹھے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ بولیں گے تو فرانس ناراض ہو جائے گا انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ بزدلانہ طرزِ عمل بین الاقوامی صورت حال کو خراب ہی کرنے کا موجب ہو سکتا ہے اس سے بہتری کی کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی ۔

بالکل یہی کیفیت جنوبی افریقہ کے بوئروں کی ایک جماعت کی ہے جو انتہا درجے کے تعصّب ، تنگ نظری اور نسلی غرور و تکبّر کی دیوانگی کو سیاہ فام لوگوں کے مسئلے کا حل قرار دے رہی ہے حالانکہ شرف انسانیت کی اس سے زیادہ تحقیر کوئی نہیں ہو سکتی ۔ یہ لوگ آج اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں یورپ صدیوں پہلے تھا اور اس سے آگے بڑھنے میں اسے خدا جانے خون اور آگ کے کتنے طوفانوں سے گزرنا پڑا ۔

اصل خطرہ

مجھے قطعاً اندیشہ نہیں کہ فرانس یا جنوبی افریقہ کے بوئر یا کانگو کے استعمار دوست وطنی یا استعمار پرست اہل بلجیئم یا پرتگیز یا کوئی اور افریقہ کی آزادی کا راستہ روک سکے گا ۔ طوفان خس و خاشاک کے ڈھیروں یا گرد و غبار کے انباروں سے کبھی نہیں روکے جا سکے ۔ افریقہ بہر حال آزاد ہوگا ۔ سامراج کا طلسم ٹوٹ چکا ۔ انسانوں کو مویشی کے ریوڑوں کی طرح چرانے کا دور گزر چکا ۔ اسلام نے عام حریت کا جو خواب چودہ سو سال پیشتر دیکھا تھا اس کی تعبیر آفتاب جہاں تاب کی طرح افق عالم پر طلوع ہو رہی ہے ۔ اندیشہ صرف یہ ہے کہ فرنگیوں کی مذبوحی حرکتوں سے باشندگان افریقہ کے دل پر جو چرکے لگیں گے ان کا نتیجہ کیا نکلے گا ؟ یورپ کی قوت کا پلڑا اوپر اٹھ رہا ہے ۔ افریقہ کی قوت کا پلڑا قدرت کی مہربانی سے لحظہ بہ لحظہ جھکتا چلا جا رہا ہے ۔ دل پر زخم کھائی ہوئی یہ قوت جب اپنا زور دکھائے گی تو اس کی زد سے یورپ کیوں کر بچ سکے گا ؟ جو طاقتیں آج

فرانس، پرتگال یا دوسرے یورپی ملکوں کی پاسداری میں سرگرم ہیں کیا وہ اس نئی قوت کی تندی و تیزی کے جوہری بم سے کسی کو بچا سکیں گی؟

ساربان! یاراں بہ یثرب ما بہ نجد

اقبال کو فطری قوتوں کی کارفرمائی کے رجحانات کا صحیح اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کسی انسانی گروہ کے طبعی جوہر ہمیشہ کے لیے خواب سنگین میں متحجر نہیں رہ سکتے۔ انھیں افریقہ کی بیداری اور آزادی کا یقین تھا۔

ان کا یہ ارشاد آج بھی درست ہے کہ ملت بیضا کے ربط و ضبط پر مشرق کی نجات موقوف ہے اس مشرق میں ایشیا اور افریقہ دونوں شامل ہیں مگر افسوس کہ جو مسلمان براہِ راست اقبال کے مخاطب تھے انھوں نے ربط و ضبطِ ملت بیضا کا مطلب نہ سمجھا اور اس شرف سے اب تک محروم چلے آتے ہیں جو انھیں پورے مشرق کی نجات کے سلسلے میں مفید و کارگر سعی و کوشش انجام دینے سے حاصل ہو سکتا تھا۔

سوڈانی درویش کے جس پیغام کا ایک حصہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے اس کا آخری حصہ "جاوید نامہ" میں پڑھنا چاہیے۔

ساربان! یاراں بہ یثرب ما بہ نجد
آں حدی کو ناقہ را آرد بہ وجد

("لیل و نہار" لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۶۱ء)

اقبالؒ اور تربیت عوام

اقبالؒ کے کلام پر ایسے مقالے بہت لکھے جاتے ہیں جن میں بعض دقیق علمی نکات پر بحث ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس انداز کے مقالے صرف انھی اصحاب فکر و نظر کے لیے موزوں سمجھے جا سکتے ہیں جنھیں علم و دانش خصوصاً حکمت و فلسفہ میں بلند پایہ حاصل ہو۔ کلام کے ان حصّوں پر عموماً بہت کم گفتگو کی جاتی ہے جن کا تعلق عوام کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و درستی سے ہے۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ میں شانِ اسلامیت پیدا ہو جائے یعنی وہ اپنے اصولی عقاید اور بنیادی اعمال میں سب سے ممتاز اور نمایاں نظر آئیں۔

میرے اندازے کے مطابق اقبالؒ نے تعلیم و تربیت عوام کے سلسلے میں جو کچھ کہا (اور "عوام" سے وہ لوگ خارج نہیں جنھیں ہم اپنی وضع کردہ اصطلاح میں "خواص" کہتے ہیں) وہ اوّلاً براہِ راست قرآنی تعلیم سے ماخوذ ہے۔ ثانیاً ملّت کی صحیح تعمیر ان اصولوں کے سوا ہو ہی نہیں سکتی۔

اگر آپ ایک مضبوط و مستحکم عمارت بنانا چاہتے ہیں تو سوچیے کہ یہ کام انجام دینے کی صحیح صورت کیا ہے؟ اوّل یہ کہ عمارت کے لیے ایک موزوں مقام تلاش کی جائے۔ دوم یہ کہ جو نقشہ آج سے چودہ سو سال پیشتر بنا دیا گیا تھا اس کی ضرورت کے مطابق بہترین سامان فراہم ہو۔ پھر پہلے بنیادیں استوار کی جائیں بعد ازاں پوری احتیاط اور توجہ سے انتہائی محنت و مشقت اٹھا کر عمارت مکمل کر دی جائے اور وہ تمام تدبیریں بروے کار لائی جائیں، جو کسی حصار کے استحکام و پایداری کے لیے لازم و ناگزیر مانی جاتی ہیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ کیا جائے گا تو جو کچھ بنے گا وہ اس آشیانے کے مشابہ ہوگا جو "شاخ نازک" پر

بنایا جاتا ہے اور اس میں استواری پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسی عمارت کو سیلِ حوادث کا ایک ہی ریلا خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ امتحاں گاہ زندگی کے بادل کی ایک ہی پُرزور تراوش ملیامیٹ کر ڈالے گی اور تعمیر کرنے والے حسرت تعمیر کے عبرت ناک پیکر بن جائیں گے۔

ہم سالہا سال سے جو کوششیں اور کاوشیں کر رہے ہیں ان کی ناتمامی اور حسرت انجامی کا اصل راز یہی ہے کہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے صحیح طریق عمل اختیار نہیں کرتے۔ باغ لگانا چاہتے ہیں لیکن نہ یہ دیکھتے ہیں کہ جو مقام ہم نے تجویز کیا ہے اس کی قوت نمو کا کیا حال ہے۔ نہ پودوں کے لیے بہ قدر ضرورت آبیاری کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ نہ ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کے مناسب انتظامات پر ہماری نظر ہوتی ہے۔ فصل بوتے ہیں لیکن نہ کھیت میں ہل چلاتے ہیں جس کے بغیر زمین کی صلاحیتِ نشوونما آمادۂ کار نہیں ہو سکتی اور نہ صالح اور عمدہ بیج فراہم کرنے پر ہماری کوئی توجہ ہے۔ غور فرمائیے کہ ایسی سعی و کوشش کیوں کر نتیجہ خیز و بارآور ہو سکتی ہے؟

ہم نے چند کلمے رٹ لیے ہیں جنھیں مختلف مجالس و مجامع میں چند روز کے لیے بار بار دہراتے رہتے ہیں لیکن جب تک ان کلموں کی معنویت اپنے اوپر طاری نہ کر لیں مطلوب نتیجہ کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی طبیب یا ڈاکٹر کسی مریض کا معائنہ کر کے نسخہ لکھ دے تو کیا وہ نسخہ مریض کو سناتے رہنے سے مرض دور ہو جائے گا؟ اگر آپ لاہور سے پشاور یا پشاور سے کراچی جانے کے آرزومند ہیں تو کیا ریلوے کے ٹائم ٹیبل کا متعلقہ حصہ یا پی آئی اے کی پرواز کا پروگرام پڑھتے رہنے سے منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے؟ اگر آپ بھوکے ہیں تو اشیائے خورونوش کے نرخ نامے دیکھ دیکھ کر بھوک کے ازالے کی امید پوری ہو جائے گی؟

اصل شے یہ ہے کہ مقاصد کے مطابق عمل پر خاص توجہ کی جائے۔ اگر ہمارا عقیدہ واقعی

یہ ہے کہ ہماری دنیوی اور اخروی فلاح کا انحصار صرف اسلام کے پیش کیے ہوئے نقشۂ عمل پر ہے تو سوچیے کہ ہم نے اب تک قوم کو اسلام کے مطابق کاربند بنانے کے لیے کیا کچھ کیا اور اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے ؛ یقیناً ہم نے اسلام کا مقدس نام دعووں میں اس زور شور سے بار بار دہرایا کہ اس کی کوئی نظیر شاید ہی مل سکے ، لیکن اس کی حیثیت وہی رہی کہ ہم بیماروں کو اطبا کی تجویز کردہ دوائیں پلا کر نہیں صرف نسخے سنا سنا کر تندرست بنا لینے کے خواب دیکھتے رہے اور ایسے خواب دنیا میں آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے ۔

زندگی عمل پر موقوف ہے اور اسلام انسان کے لیے حسن عمل کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے ۔ تاہم جب تک وہ نقشہ ہمارے اعمال میں جذب نہ ہوگا ۔ جب تک اس پر کاربند ہونے اور رہنے کی تڑپ ہماری رگوں میں دوڑنے والے خون کے ایک ایک قطرے میں سرایت نہ کر جائے گی ، ہم میں وہ اسلامیت کیوں کر پیدا ہوگی جو دنیا اور عقبیٰ میں ہماری فلاح کی ضامن ہے ؟

اقبالؔ نے مختلف صورتوں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات ہمارے سامنے پیش کی ہیں ہم نے اس مرحوم کے کلام سے حیجما نہ نکتے پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی ، لیکن یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس کی پیش کردہ تعلیم کو اسلام کی صحیح تعلیم سمجھ کر اپنے اعمال میں جذب کیا اور اپنے آپ کو اس تعلیم کے عملی پیکر بنانے کی کوئی کوشش کی ۔ سوچیے کہ آیا اس مرحوم کی بارگاہ عظمت میں عقیدت کے رنگا رنگ گلدستے پیش کرنے اور اس کی مقدس یاد منانے کا حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے ؟ حاشا ، ثم حاشا ، ثم حاشا۔

اقبالؒ کی بالکل ابتدائی نظموں میں سے ایک نظم " سید کی لوح تربت " ہے ، جس میں اس نے سر سید مرحوم کی زبان سے قومی تعمیر کے بعض اہم نکتے پیش کیے تھے ۔ فرماتے ہیں :

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

دانہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں — چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے — دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

یہ دین کے عالموں اور راہ حق کے ہادیوں کے لیے کتنی اہم، کتنی پاکیزہ اور کتنی ضروری تعلیم تھی۔ اسلام ترک دنیا کا راستہ دکھانے کے لیے نہیں تسخیر دنیا کا راستہ دکھانے کے لیے آیا تھا۔ اس کا مدعا یہ نہ تھا کہ فرقہ بندی کی آگ کو ہوا دے کر بھڑکایا جائے، جو قوم کا شیرازہ جلا کر رکھ دے۔ عالم ہو یا عامی، اس کا قلم باہم محبت و الفت پیدا کرنے کے لیے وقف رہنا چاہیے اور اس کی زبان پر کوئی ایسا کلمہ جاری نہ ہونا چاہیے جس سے کسی کا دل دُکھے۔

قرآن مجید پر ایک نظر ڈالیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔
(آل عمران ۱۰۳)

اور دیکھو! سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑلو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔ اللہ نے تمھیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو جاؤ۔ تمھارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے لیکن اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے۔

اگر ہم واقعی مسلمان ہیں تو اس پاکیزہ تعلیم کے عملی نمونے بنے بغیر راستہ کون سا ہے؟ ہماری اخوت، ہماری برادری، ہمارا بھائی چارہ اللہ کی طرف سے ایک نعمت تھا اور اس نعمت سے محرومی سلامت عقل سے بعید ہے۔ اقبالؒ نے یہی تعلیم "جواب شکوہ" میں بھی دی تھی۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی ، اللہ بھی ، قرآں بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلماں بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

"سید کی لوحِ تربت" کے اقتباس میں سے آخری شعر نے سورہ طٰہٰ کے اس سوال کی یاد تازہ کر دی جو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا۔ پہلے فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ تمہارا پروردگار کون ہے؟ اس کا جواب مل گیا تو پوچھا:

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی ۝ (۵۱)

پھر ان کا کیا حال ہونا ہے جو پچھلے زمانوں میں گزر چکے؟ موسیٰ نے کہا اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتے میں ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑ جائے۔

ہمارے تمام جھگڑے اور تمام کاوشیں اس کے سوا کیا حیثیت رکھتی ہیں کہ قرونِ اولیٰ میں جو کچھ پیش آیا، اس کی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اپنی نجات کی تدبیروں پر عمل پیرا ہونے سے قطع نظر کر کے صدیوں پیشتر کے واقعات کا فیصلہ کرنے میں مصروف ہیں جو کسی خاص اسلوب پر طے بھی ہو جائیں تو اب ان پر عمل نہیں کرایا جا سکتا۔

رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

اقبالؒ کا مطلب وہی تھا جو پیش کر دیا گیا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

تو اگر کوئی مدبّر ہے تو سن میری صدا ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجھک جانا نہیں زیبا تجھے نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرمانروا کے سامنے بے باک ہے

دائرۂ سیاست میں ہماری تمام مصیبتوں، پریشانیوں اور ناکامیوں کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارے اربابِ سیاست دلیری سے محروم ہوگئے۔ حقیقی مقصد صاف صاف پیش کر دینے سے جھجکتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ نیت گوناگوں اغراض کے لوث سے بوجھل ہے۔ اس میں نیکی کی روشنی اور راستبازی کا جوہر ماؤف ہو چکا ہے۔ یہ طرز عمل مومن کی شان سے بعید ہے۔ مومن وہ ہے جو فرمانروا کی قوت قاہرہ سے مطلقاً مرعوب نہیں ہوتا۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظالم حکمران کے روبرو کلمۂ حق کہنا بہترین جہاد ہے۔ جو مسلمان اس فرض سے بے پروا ہو جائے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ حق اسلامیت ادا کرنے کے لائق نہ رہا۔

اقبالؒ کی تعلیم کے یہ حقیقی تعمیری اجزا ہیں جنھیں ملت کے ایک ایک فرد کے دل میں اتارنا چاہیے۔ حکیمانہ نکتہ نوازیاں اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیاں بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہیں مگر تعمیر ملت کا کام اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ افراد کو اسلامی تعلیم کے عملی پیکر بنایا جائے۔

پھر اقبالؒ ولایت گئے تو انھوں نے "التجائے مسافر" میں اپنی چند آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا:

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزل مقصود، کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

اللہ نے اپنی رحمت سے اقبالؒ کی یہ تمنائیں اور آرزوئیں پوری کر دیں اور آج زمانہ ان کے پورا ہونے کا گواہ ہے لیکن کیا کبھی آپ نے غور فرمایا کہ یہ آرزوئیں بھی اسلامی درد سے لبریز قلب ہی کی آغوش میں پرورش پا سکتی تھیں اور سچے مسلمان کی زبان پر ایسی ہی

دعائیں آسکتی ہیں۔

"جواب شکوہ" میں ایک مقام پر "سچے مسلمان" کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:

دم تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک — عدل اس کا تھا قوی لوث مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک — تھا شجاعت میں وہ اک ہستیٔ فوق الادراک

خود گدازی نم کیفیت صہبا لیش بود
خالی از خویش شدن صورت مینا لیش بود

ہر مسلماں رگ باطل کے لیے نشتر تھا — اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوتِ بازو پر تھا — ہے تمھیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

یہ آئینہ پیش نظر رکھ کر اپنا چہرہ دیکھیے ان میں سے کسی خصوصیت کی ہلکی سی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے (الا ماشاء اللہ) اور معاملہ افراد کا نہیں قوم اور ملت کا ہے۔

پھر اسلاف کرام اور عہد حاضر کے مسلمانوں کا مقابلہ کیا ہے۔ "جواب شکوہ" آج سے قریباً ساٹھ سال پیشتر پڑھا گیا تھا لیکن اس تقابل کی صحت میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ فرماتے ہیں:

ہر کوئی مست مے ذوق تن آسانی ہے — تم مسلماں ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضب ناک، وہ آپس میں رحیم — تم خطاکار و خطا بیں وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم — پہلے ویسا کوئی پیدا کرے تو کرے قلب سلیم

تخت فغفور بھی ان کا تھا سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی

خود کشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خود دار　　تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار　　تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی

یہ تعلیمات زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کی یاد کے سلسلے میں اصل کام یہی ہے کہ اس نے زندگی بھر جو کچھ فرمایا اسے لباسِ عمل پہنایا جائے۔ مسلمانوں میں اس کی دعوت کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے۔ اسلامیت کے وہی نقشے ایک ایک مسلمان کے سامنے رات دن پیش ہوتے رہیں تاکہ ان پر کاربند ہونے کی ایک ہمہ گیر تڑپ پیدا ہو جائے۔

افراد کا اصل وظیفہ کیا ہے؟ وہ ملت کے اجزا ہوتے ہیں۔ اجزا میں جب تک صالحیت پیدا نہ ہوگی ان سے صالح اور کارفرما قوم کیونکر وجود میں آئے گی؟ اقبالؒ نے "پیام عشق" میں کہا تھا:

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسم مجاز ہو جا

افراد میں باہم گرپیوستہ ہو کر ایک قوم بننے کا جذبہ ہی کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے جب تک ان کی معنویت نہ بدلے گی اور وہ اسلام کے عملی نمونے نہ بنیں گے؟ واضح رہے کہ انسانوں کی ہر بھیڑ پر، خواہ کتنی ہی بڑی اور کثیر الانفار ہو، قوم کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ قوم کے لیے خاص اوصاف و اخلاق کا ہونا لازم ہے۔ اوصاف و اخلاق ہی کی بنا پر قوموں کے کردار میں ایک خصوصی امتیاز پیدا ہوتا ہے لیکن جو انسانی بھیڑ قوم نہ بن سکے یا اس پر حقیقۃً لفظ قوم کا اطلاق موزوں نہ سمجھا جا سکے اس میں کوئی بھی عملی امتیاز نہیں ہوتا۔ کوئی بھی اخلاقی برتری

نظر نہیں آتی ۔ اس پر جس پہلو سے بھی نظر ڈالی جائے ناساز و بے اندام معلوم ہو گی۔ بھیڑ اس وقت قوم بنتی ہے جب اس کے افراد کے فکر و عمل میں خوشگوار تغیر پیدا ہو جائے۔ ان افراد میں صالحیت کی چمک دمک نظر آئے۔ پھر یہ افراد باہم پیوستہ ہوں گے تو ایک زندہ و پایندہ قوم وجود پذیر ہو گی جس کے عمل میں استواری اور عزائم میں پختگی ہو گی۔ بلند مقاصد کے لیے مسلسل جانبازانہ جد و جہد کی روح اس کی رگ رگ میں دوڑتی پھرتی نظر آئے گی۔ ایسی قومیں پست فطرت اور ننگ انسانیت معاشروں میں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ اپنی دسترس کی حد تک معاشروں کے دامن کی آلودگی دھو ڈالتی ہیں۔

پھر دیکھیے ۔ اقبالؒ نے ہمارے سامنے وہ پیمانے بھی پیش کر دیے جن سے کام لیکر ہم ملت کی حقیقی دردمندی، پر خلوص بہی خواہی اور سچی محبت کا جائزہ لے سکتے ہیں اور فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون اپنے دعووں میں واقعی مخلص ہے اور کس نے اپنی اصل مکروہ اغراض کو چھپانے کے لیے عوام فریبی کی خاطر ریائی اور نمایشی دردمندی کی نقاب چہرے پر ڈال رکھی ہے ۔ فرماتے ہیں:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

خدا کے بندوں سے پیار کی حقیقت کیا ہے؟ ان کی بہتری اور بہبود کے لیے بے پناہ کام۔ قوم کی منفعت کے لیے اپنی ہر منفعت کو بے دریغ قربان کر دینا۔ ملت کا ایک بھی فرد بے چین رہ جائے تو خود چین نہ لینا۔ ایک بھی روح مضطرب ہو تو خود اضطراب کے انگاروں پر لوٹنا۔ کیا یہ معلوم نہیں صدیق اکبرؓ نے خلافت سنبھال لینے کے بعد اپنے لیے صرف اتنی روزی قبول کی تھی جو معمولی درجے کے انسان کے لیے کفایت کرتی تھی؟ پھر اس دنیا سے رخصت کا وقت قریب آیا تو دو سال اور چند مہینے کے قبول کیے ہوئے روزینے کا حساب کرا کے پوری رقم بیت المال کو لوٹا دی تھی؟ کیا یہ معلوم نہیں کہ اسی مسلک پر فاروق اعظمؓ

کاربند رہے جب مصر، شام اور ایران فتح ہوگئے اور خلیفۂ وقت کے مشاہرے میں خود اکابر صحابہؓ نے اضافے کی خواہش کی تو کسی کو یہ درخواست پیش کرنے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ کی وساطت سے یہ معاملہ فاروق اعظمؓ تک پہنچایا گیا تو جانتے ہو جواب کیا ملا؟ یہ کہ میں وہ مسلک چھوڑ نہیں سکتا جس پر رسول اللہ صلعم اور ابوبکرؓ چلے؛ کیا یہ معلوم نہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ میرے لیے بیت المال میں سے صرف دو پیمانے ہیں: ایک اپنے اور اہل وعیال کے لیے، دوسرا مہمانوں کے لیے؛ کیا یہ معلوم نہیں کہ حضرت عثمانؓ نے بیت المال سے ایک حبّہ بھی نہ لیا کیوں کہ وہ ضرورت مند نہ تھے؟

یہ بزرگ تھے جنھیں خدا کے بندوں سے پیار تھا۔ یہ وہ نمونہ ہائے عمل تھے جو قیامت تک ہمارے ہی لیے نہیں پورے عالم انسانیت کے لیے بھی باعث فخر و ناز رہیں گے۔

پھر دیکھیے، اقبال کا بتایا ہوا یہ معیار کتنا واضح اور روشن ہے، جس سے ہر فرد بے تکلف کام لے سکتا ہے۔ ہر فرد جان سکتا ہے کہ خدا کے بندوں سے پیار کے مدعیوں نے اپنے عہد کفالت میں مخلوق کے لیے کیا کچھ اور کتنا کچھ کیا اور اپنے لیے کیا کچھ رکھا؛ خدا کے بندوں کی کیا کیا خدمات انجام دیں اور ان کے اپنے ایثار کی صورت کیا رہی؛ اقبال کی یہی بنیادی تعلیمات بار بار عوام تک پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ اس مرحوم کا کلام صرف نظری اعتبار سے نہیں عملی اعتبار سے بھی عام و ہمہ گیر ہو جائے۔

اقبال نے "جواب شکوہ" کے آخری بند میں جو کچھ فرمایا تھا وہ اس وقت جتنا صحیح تھا جب یہ نظم کہی گئی تھی اس سے بدرجہا زیادہ آج صحیح ہے، جب اقبال کو اس دنیا سے رخصت ہوئے تیس برس گذر چکے ہیں[1] یعنی

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری

---

[1] یہ مقالہ ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا تھا۔

ماسوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(یوم اقبال ۔ کراچی ۱۹۶۸ء)

علّامہ اقبالؒ اور مولانا آزادؒ

بچہ گیرند عیارِ ہوس و عشق دگر
رسمِ بیداد مبادا ز جہاں برخیزد

بعض اصحاب کا یہ ارشاد کئی مرتبہ مجھ تک پہنچا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے سیکڑوں شعر اپنی تحریروں میں نقل کیے اور "غبارِ خاطر" تو پوری شعروں ہی سے لبریز ہے مگر تعجب ہے علّامہ اقبال مرحوم و مغفور کا کوئی شعر کبھی نقل نہ کیا۔ سوال یہ ہے، اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکل آیا کہ مولاناؒ کے دل میں علّامہ اقبالؒ کے شعروں کی زیادہ قدر نہ تھی؟

ابتدائی دورِ مطالعہ میں جو دواوین اشعار انسان کی نظر سے گزر جاتے ہیں وہی عموماً حافظے میں محفوظ رہ جاتے ہیں اور تواتر نقل و کتابت سے وقتاً فوقتاً ذہن میں تازہ ہوتے رہتے ہیں۔ منزلِ بلوغ سے گزر کر جو مجموعہ ہائے اشعار مطالعہ میں آتے ہیں ان کے سلسلے میں یہ صورت پیدا نہیں ہوتی۔

حضرت علّامہؒ جب پختگی کے مرحلے پر پہنچے تو مولانا آزادؒ خود خاصے پختہ ہو چکے تھے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ابتدائی دورِ مطالعہ کے اشعار جس بے تکلفی سے مستحضر ہوتے ہیں دورِ پختگی کے پڑھے ہوئے اشعار کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ عام صورت ہے اس میں کسی کی پسند یا ناپسند کا کیا سوال ہے؟ کیا یہ معلوم نہیں کہ خود حضرت علّامہؒ نے اپنے ابتدائی دور کے اشعار کا بڑا حصہ دانستہ حذف کر دیا اور اسے اپنے مستند کلام میں شامل نہ کیا کیونکہ وہ انھیں اشعار کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے جو کوئی نہ کوئی مفید مقصد پورا کرتے تھے۔

ایک مثال مولانا شبلی مرحوم و مغفور سے مولانا آزادؒ کے روابط آخری دور تک نہایت خوشگوار رہے۔ ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ ان کے اشعار بھی

مولانا آزاد برابر سنتے اور پڑھتے تھے مگر جس حد تک میرا حافظہ مساعدت کرتا ہے ایک شعر کے سوا مولانا شبلی کا کوئی شعر مولانا آزاد کی تحریروں میں نہیں دیکھا یعنی ؛

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے است سالک را
خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوے ایماں ہم

یا ممکن ہے یہ شعر بھی کہیں نقل ہوا ہو، جو مولانا شبلی ہی کا ہے ؛

از ردّ و از قبولِ تو فارغ نشستہ ایم
اے آں کہ خوبِ ما نہ شناسی ز زشتِ ما

کیا کوئی حق شناس اس صورت حال سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ مولانا آزادؒ کو مولانا شبلی سے معاذ اللہ دشمنی تھی یا ان کے اشعار پسند نہ تھے؟

معاملے کا دوسرا پہلو

پھر اس سوال کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ اگر مولانا آزادؒ نے علامہ مرحوم کا کوئی شعر کبھی نقل نہ کیا تو خود علامہ مرحوم نے کب مولاناؒ کے کمال علم و فضل کی تحسین میں کچھ فرمایا؟ حالانکہ علامہؒ "الہلال" سے ابتدا ہی میں اتنے متاثر تھے کہ دو مہینے کے اندر اندر انھوں نے دس خریدار مہیا کر کے ان کے نام "الہلال" کے دفتر میں بھیج دیے تھے جیسا کہ ۹۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت "الہلال" سے واضح ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ علامہ مرحوم کی طبیعت کو اس قسم کی سرگرمیوں (کسی جریدے کے لیے خریدار فراہم کرنا) سے قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔

پھر "الہلال" ۱۹۱۴ء کے اواخر میں بند ہو گیا اور مولاناؒ نے ۱۹۱۵ء میں "البلاغ" جاری کیا تو اس کے پہلے صفحے پر علامہ مرحوم ہی کی نظم شائع ہوئی تھی، جو مولاناؒ کا مقام دعوت پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی تھی اور یہ عرفی کے اس شعر کی تضمین پر مشتمل تھی ؛

نوا را تلخ ترمے زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمے خواں چو محمل را گراں بینی

یقیناً مولانا آزادؒ نے "البلاغ" کے اجرار کا فیصلہ کرتے ہی علامہ مرحوم کو نظم کے لیے لکھا ہوگا کیونکہ وہ خود کسی کو کوئی نظم بھیجنے کے عادی نہ تھے اور اس نظم کے اعترافِ عظمت کے لیے یہی شہادت کافی ہے کہ "الہلال" کے اڑھائی برس یا "البلاغ" کے چند مہینوں اور "الہلال" دور دوم کے چھ ماہ میں علامہ کی اس نظم کے سوا کبھی کوئی نظم پہلے صفحہ پر شائع نہ ہوئی اور پورا صفحہ اس کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔

بعض بدیہی امور

ایک قدم اور آگے بڑھائیے۔ حضرت علامہ نے مرزا داغ کا مرثیہ کہا جو تئیس ۲۳ اشعار پر مشتمل ہے اس کے برعکس شبلی اور حالی دونوں کے ماتم میں صرف دس شعر کافی سمجھے۔ کیا اس بنا پر کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اقبال کے نزدیک حالی اور شبلی مل کر بھی داغ کے برابر نہ تھے؟ حاشا وکلا۔

میاں فضل حسین مرحوم کے والد کا انتقال ہوا تو علامہؒ نے بتیس ۳۲ شعر کی ایک نظم کہہ کر میاں صاحب کے پاس بھیج دی تھی جو اسی زمانے کے "مخزن" میں بھی چھپ گئی تھی اور "بانگِ درا" میں بھی "فلسفہ غم" کے عنوان سے موجود ہے۔

پھر حضرت علامہؒ کی کوئی نظم ان کے نہایت محترم استاذ مولانا سید میر حسنؒ کے مرثیے میں موجود نہیں۔ والدہ ماجدہ کے انتقال پر حضرت نے ایک ایسی نظم کہہ دی جس کی کوئی مثال میرے علم کی حد تک کسی زبان کے ادبیات میں شاید ہی مل سکے۔ "بانگِ درا" میں اس کے کم و بیش چھیالیس اشعار موجود ہیں۔ معلوم ہے کہ کچھ اشعار حذف بھی کر دیئے گئے تھے۔

کسی کے اشعار تحریرات میں نقل نہ ہونا، اس کے لیے اعترافِ عظمت میں تامل کی دستاویز نہیں جس طرح کسی کے لیے شعر نہ کہنا گہری محبت و عقیدت کے منافی نہیں سمجھا جا سکتا۔ صرف سطح بین لوگوں ہی کے دل و دماغ اس قسم کے افکار واہیہ کے مورد بن سکتے ہیں۔ باقی رہا بعض امور میں فکر و نظر کا اختلاف تو یہ کم و بیش تمام عظیم انسانوں کے درمیان موجود رہا ہے اور اسے مناسب حدود سے آگے بڑھانے کی سعی ہرگز محمود نہیں سمجھی جا سکتی۔

ایک افسوسناک روایت

ایک حلقے میں یہ روایت گردش کرتی رہی ہے کہ حضرت علامہؒ نے آزاد کے "ترجمان القرآن" کی نسبت فرمایا تھا، قرآن مجید کی یہ تفسیر کانگرسی نقطۂ نگاہ سے کی گئی ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن۔ جس شخص نے یہ روایت حضرت علامہؒ سے منسوب کی، وہ میرے نزدیک نہ تو حضرت کی طبیعت و عادت سے آشنا تھا اور نہ اسے اصل روایت کی بے سروپائی کا اندازہ ہو سکا۔ روایت کی سند اور منقول الفاظ سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو مختلف سوال سامنے آتے ہیں:

۱۔ جس شخص نے یہ الفاظ سنے، آیا اس نے دریافت کر لیا تھا کہ لفظ "تفسیر" لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یا اصطلاحی معنی میں ؟

۲۔ آیا دریافت کر لیا تھا کہ "کانگرسی" تفسیر کیسی ہوتی ہے؟

۳۔ "ترجمان القرآن" قرآن مجید کا ترجمہ ہے جس کے ساتھ بعض مطالب کی تشریح و توضیح کے لیے حواشی بھی موجود ہیں۔ بعض مسائل پر قدرے تفصیل سے بھی لکھا گیا ہے۔ جلد اوّل میں ایسی مثالیں کم اور جلد دوم میں زیادہ ہیں یہ ارشاد کس جلد سے متعلق تھا؟

۴۔ "ترجمان" کی جلد اوّل کے ساتھ سورۃ فاتحہ کی تفسیر کے بعض اجزا شائع ہوئے تھے کیا محولہ بالا روایت کا تعلق سورۃ فاتحہ کی نامکمل تفسیر سے تھا یا ترجمان کی دونوں جلدوں سے؟

۵۔ آیا راوی نے چند آیات کے ترجمے یا حواشی کے سلسلے میں ایک دو مثالیں دریافت کر لی تھیں، جن کی بنا پر اس کتاب کو "کانگرسی تفسیر" کہا گیا؟

ظاہر ہے کہ ان سوالات کے شافی جواب حاصل کیے بغیر نہ اصل روایت کو مستند مانا جا سکتا ہے اور نہ اس پر مفصل غور و بحث کی کوئی صورت ہے۔

مسئلے کی اہمیت

یہ بھی مناسب نہیں کہ اصل مسئلے کو معلق چھوڑ دیا جائے۔ اس کا تعلق قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ سے ہے، جس پر دونوں جہانوں کی

زندگی میں فوز وفلاح کا انحصار ہے اور اس ترجمے سے ہے جس میں قرآن پاک کے بنیادی حقایق کے بارے میں نہایت اہم اشارے ملتے ہیں۔ ایسے اشارے کسی دُوسرے ترجمے یا تفسیر میں شاید ہی مل سکیں۔ پھر اس کا اسلوب پیش کش "دعوت" کا ہے جسے قرآن مجید کے اسلوب بیان سے خاص مناسبت ہے۔ آیا اب وہ راوی بتا سکتے ہیں کہ کون کون سی آیات کے ترجموں یا حواشی سے "کانگریسیت" کے لیے تائید کے پہلو نکلتے ہیں جن کی بنا پر کوئی تصنیف اساسی اعتبار سے "کانگرسی" بن جاتی ہے؟

کتنے رنج وقلق کا مقام ہے کہ بعض لوگ انتہائی بے تکلفی سے ایسی باتیں بعض بزرگ ہستیوں سے منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ ان باتوں کی حقیقی حیثیت کا بھی انھیں کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

ایک حقیقت

غرض یہ انتساب سراسر محل نظر ہے لیکن اگر کوئی شخص اس انتساب پر بے وجہ اصرار کرے تو صاف صاف عرض کر دینا چاہیے کہ علامہ مرحوم و مغفور اپنے گوناگوں محاسن وفضائل کے باوصف معصوم نہ تھے جس طرح مولانا آزاد مرحوم و مغفور معصوم نہ تھے اور جس طرح راقم الحروف ان بزرگوں کے مقابلے میں زیادہ ثبت حیثیت سے خطاکار وغیر معصوم ہے۔

میرے دل میں حضرت علامہ مرحوم کے لیے محبت وعقیدت کے جو جذبات ہمیشہ موجزن رہے اور تادم آخر موجزن رہیں گے، ان کی کیفیت الفاظ میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس مرحوم نے کامل بے نفسی سے نہ صرف اسلام و مسلمین بلکہ پورے عالمِ انسانیت کی جو گراں بہا خدمات انجام دیں، وُہ ہماری قومی تاریخ کا ایسا درخشاں باب ہیں جس کی ضیاباری کبھی ماند نہ پڑے گی اور اس کی حقیقی حیثیت ابھی تک اکثر افرادِ ملت پر منکشف ہی نہیں ہو سکی۔ وُہ اپنے دایرہ اختیار میں بھی مرحوم کی بنیادی تعلیمات کو لباسِ عمل نہ پہنا سکے۔ ان تعلیمات کو عالمی پیغام بنا لینے کی امید کیوں کر کامیاب ہو سکتی ہے؟ اکثر لوگوں نے علامہ کو سرسری نظر سے

دیکھا ہے یا ان کا نام سن رکھا ہے میں نے اپنی زندگی کے کم و بیش سولہ سال میں ان کی بابرکت صحبت سے بیش بہا فائدے اٹھائے ہیں۔ میں جو کچھ بھی کہوں اس میں بڑا حصّہ اسی بزرگ ہستی کے فیضان کا ہے۔ بلاشبہ میں نے روش عام کی پیروی میں انتسابات کو کبھی اپنے لیے سرمایہ فخر نہیں بنایا اور یہ بھی اسی مرحوم کی تربیت کا ایک نتیجہ ہے۔ لیکن اس آسمان کے نیچے میں کسی کو بھی اپنے سے زیادہ اس مرحوم کا عقیدت مند نہیں سمجھتا۔ ساتھ ہی میرا عقیدہ یہ بھی ہے کہ کائنات انسانیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے بعد کوئی بھی معصوم نہیں جس سے فہم و عمل میں خفیف سی بھی غلطی یا خطا کا صدور ممکن نہ ہو۔

مولانا آزادؒ

اسی طرح مولانا آزاد مرحوم و مغفور سے بھی مجھے ابتدا ہی میں گہری عقیدت پیدا ہو گئی تھی جو آج تک بڑھتی ہی رہی، کم کبھی نہ ہوئی۔ میں نے ۱۹۲۳ء میں میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء کے دولت کدے میں مولاناؒ کے ہاتھ پر بیعت امامت کی تھی۔ وہ اس دور کے یگانہ عالم دین اور بے مثال جامع علوم تھے۔ انھوں نے زندگی کے ساڑھے دس سال دعوتِ اسلام، تحریکِ خلافت و تطہیر جزیرۃ العرب اور آزادی وطن کی خاطر قید و بند میں گزارے، ان کا بیش بہا علمی سرمایہ انھی مصائب میں تلف ہو گیا تاہم میں نے انھیں بھی معصوم نہ سمجھا۔ ایسا وقت بھی آیا کہ مجھے اپنی ناچیز بصیرت کے مطابق مولاناؒ کے بعض سیاسی افکار سے اختلاف کرنا پڑا کسی سے پروانۂ تحسین و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نہیں، صرف اظہار حقیقت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں نے اختلاف میں کبھی تامّل نہ کیا اور اس کی موثق شہادتیں بہ صورت مطبوعہ موجود ہیں جنھیں کوئی چاہے بھی تو نہیں مٹا سکتا۔ بایں ہمہ ان کے ساتھ پہلے بھی انتہائی عقیدت تھی اور اب بھی انتہائی عقیدت ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اب تک اپنی کسی ناچیز خدمت کے لیے کسی سے تحسین نہیں چاہی نہ کوئی سند لینے کا اضطراب دل میں پیدا ہوا، نہ کسی نوع کی ممنونیت کا دھبّا اپنے دامن پر لگانا پسند کیا۔

اگر کسی شخص سے حسن نیت کے ساتھ کوئی خدمت انجام پائی ہے تو یہ صرف اللہ کا

فضل ہے، اس کی رحمت کا کرشمہ ہے اور اس کے لیے اسی کی بارگاہِ باری تعالیٰ سے اجر کی امید رکھنی چاہیے کسی غیر کی طرف نظر بھی نہ اٹھنی چاہیے۔

اصل کام آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اصل روایت میرے نزدیک بے اصل و اساس ہے۔ معلوم نہیں لوگوں کو ایسے مشغلے کیوں پسند ہیں؟ ہمارے سامنے قومی اور ملکی مسائل کا وسیع ذخیرہ موجود ہے اسے چھوڑ کر بے سروپا اور بے معنی روایتوں کی اشاعت میں وقت اور قوت ضائع کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟

یہ بزرگ ہستیاں اپنا وظیفۂ حیات پورا کر کے اس بارگاہ میں پہنچ گئیں جہاں جزائے اعمال ملتی ہے ہمارے لیے اصل کام یہ نہیں کہ اوہام و قیاسات کی بنا پر ان کے درمیان اختلافات کی خلیجیں پیدا کرنے میں کوشاں رہیں اصل کام یہ ہے کہ ان کے محاسن و فضائل سے کسبِ فیض کے طریقے ڈھونڈیں ان کے اچھے اور مستحسن اعمال کو اپنائیں۔ ان کے بہترین مسلک پر کاربند ہوں۔ ان کے ارشاد پر عمل کے پروگرام بنائیں۔ وہ جن امور کی دعوت عمر بھر دیتے رہے ان سے اپنے لیے عمل کی روشنی حاصل کریں جو ہمیں منزل مقصود سے قریب تر لے جائے۔ دوسروں کی تضعیف کے بجائے ہمیں اپنی پختگی کا سروسامان کرنا چاہیے، کلیم ہمدانی کیا خوب کہہ گیا ہے:

ہر چند کہ از خاک بود طینت ہر دو
خشتے کہ بود پختہ بہ از آدمِ خام است

(چٹان۔ لاہور)
۱-۵-۶۷

علامہ اقبالؒ اور مولانا آزادؒ

عُرفی بغیر شعلۂ داغِ جگر نہ بُود
شمع کہ ما بہ گوشۂ کاشانہ سوختیم

خیرہ طبعی اور حق ناشناسی کے اس تاریک دور میں جن فتنوں نے نہایت ناخوشگوار صورت اختیار کی۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف شخصیتوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ کسی کی تائید و حمایت منظور ہے تو اس میں بھی اصل حدود سے تجاوز کیے بغیر دم نہیں لیا جاتا اور تجاوز بھی ایسا کہ خود اس شخصیت کو بھی، بشرطیکہ تنگ حوصلگی نے اسے احساسِ صحیح سے بالکل بے بہرہ نہ بنا دیا ہو، مدح و ستائش پر بے اختیار شرم آئے۔ پھر مخالفت ہے تو اس کی آندھیاں بھی اس زور سے چلائی جاتی ہیں کہ سب کی آنکھیں گرد و غبار سے اٹ جائیں، بینائی زائل ہو جائے تا کہ کوئی دیکھ نہ سکے، حق و انصاف کے تقاضوں کی بنا پر کہاں رکنا اور ٹھہرنا چاہیے:۔

قرآنِ مجید کی تعلیم ہم مسلمان ہیں اور قرآن مجید نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے کہ ہم ہر حال میں حق و انصاف پر انتہائی مضبوطی اور استواری کے ساتھ جمے رہیں، اگرچہ اس طرح خود ہماری ذات اور ہمارے اقرباء وغیرہ کو بھی نقصان پہنچے، سورۂ النساء میں ارشاد ہوا ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِینَ آمنو اکُونوا قوّامین	ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ
بالقسطِ شُھَدَآءَ علی اللّٰہ وَلَو	اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو اگرچہ (انصاف
علیٰ اَنفُسِکُمْ اَوِالوَالِدَین	اور گواہی سے) زد تمہاری ذات، تمہارے
وَالاقربین۔	والدین اور رشتہ داروں ہی پر پڑے۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا ہے:۔

یاَیُّہا الذین آمنو اکونو اقوامین	ایمان والو! اللہ کے لیے راست بازی پر قائم
لِلّٰہ شُہَدَاءَ بالقسطِ ولا	رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے
یجرمنکم شنان قوم	بنو، ایسا کبھی نہ کرو کہ کسی قوم کے ساتھ دشمنی کی
علیٰ الا تعدلو ا اعدلوا	تلخیاں تمہیں اس بات پر اُبھار دیں کہ اس کے
ھو اقرب للتقویٰ واتقوا	ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف پر ہی
اللہ انّ اللہ خبیرٌ بما	کاربند رہو کہ یہی تقویٰ سے لگی ہوئی بات ہے۔
تعملون ۔	اللہ سے ڈرو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے
	پوری طرح باخبر ہے ۔

عدل کے تقاضے

"انصاف" یا "عدل" کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ افراط و تفریط سے محفوظ رہ کر ہر فرد کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ فیصلے کی ترازو اٹھائی جائے تو اسے ہر اعتبار سے ہر پہلو سے کاملاً صحیح رکھا جائے۔ کسی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محبّت یا سخت سے سخت سے عداوت میں بھی کوئی پلّہ جھکنے یا اُٹھنے نہ پائے۔ کسی کے بارے میں حکم لگاتے وقت اس بنیادی اسلامی اصل سے خفیف سا بھی اختلاف مدعی اسلام اور پیرو قرآن کے لیے قطعاً زیبا نہیں۔ ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان حق، انصاف اور راست بازی پر انتہائی پختگی سے قائم و استوار ہو جائے۔ اشد مخالف کو بھی یقین ہو کہ مؤمن کی زبان سے کوئی کلمہ عدل کے خلاف نکل ہی نہیں سکتا۔ انسان کو طبعاً سب سے بڑھ کر محبّت اپنی ذات، والدین یا دوسرے عزیزوں سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ محبّت بھی انصاف کا پرچم بلند رکھنے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے میں اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ اور رُسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اس کے نزدیک دنیا کی ہر شے پر مقدّم ہیں۔ انہیں اوصاف و خصائل نے ہمیں دنیا کی بہترین اُمّت بنایا تھا۔ انہی کا زوال ہمیں پستی میں لے گیا۔ کتنے رنج و قلق کا مقام ہے کہ دینی و مذہبی تقاضے پورے کرنے کے سلسلے میں قولاً انتہائی جوش و سرگرمی کے مظاہرے کرتے رہنے کے باوصف ہم عملاً صراطِ مستقیم سے بعید تر ہوتے گئے ہیں۔

دوستانہ روابط کی ابتدا اس سلسلے کی ایک شق علامہ اقبال اور مولانا آزادؒ کے روابط کی بھی ہے۔ دونوں شخصیتوں کو قدرت نے گوناگوں فضائل ومکارم کی ایسی گراں بہا نعمتوں سے نوازا تھا جو صدیوں کے بعد خوش نصیبوں کے حصّے میں آتی ہے۔ ان کے درمیان خوشگوار دوستانہ روابط کی ابتدا غالباً ۱۹۰۴ء میں ہوئی جب مولانا آزاد انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کے لیے لاہور آئے تھے اگرچہ ان کی عمر سولہ سترہ برس سے زیادہ نہ تھی تاہم تقریر ایسی کی کہ اکثر شرکاء اجلاس نے ایسی تقریر پہلے کبھی نہ سُنی تھی۔ شہر آفاق مقررین کو بھی شکایت رہتی کہ انہیں بقدر ضرورت وقت نہیں دیا لیکن مولانا آزادؒ کے لیے اجلاس میں دوبارہ تقریر کی غرض سے وقت نکالا گیا۔ اسی وقت سے علامہ مرحوم اور مولانا مرحوم میں دوستانہ ربط ضبط کا آغاز ہوا جو دونوں کے خداداد جوہروں کی شناخت اور تحسین کا طبعی نتیجہ تھا حالانکہ اس وقت دونوں میں سے کسی کو بھی وہ عظمت حاصل نہ تھی جس کی مسندیں چند سال بعد آراستہ ہوئیں پھر علامہ مرحوم ولایت چلے گئے اور مولانا مرحوم مختلف مشاغل میں مصروف رہے۔

"الہلال" کا دور ان دوستانہ روابط کا دوسرا دور اس وقت منظرِ عام پر آیا جب ۱۹۱۲ء میں مولانا مرحوم نے کلکتہ سے الہلال جاری کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولاناؒ نے اقبال مرحوم کے نام "الہلال" اعزازی طور پر جاری کر دیا ہوگا، جس طرح بعض دوسرے اکابر و مشاہیر کے نام جاری کیا۔ اس کی ایک شہادت خواجہ حالی مرحوم و مغفور کے نام اجرا اخبار سے ملتی ہے، خواجہ حالی مرحوم "الہلال" کو بند کا بند واپس فرماتے رہے کیونکہ آنکھوں کی خرابی کے باعث پڑھ نہیں سکتے تھے اور انہیں گوارا نہ تھا کہ اس معذوری میں ادارہ الہلال خواہ مخواہ زیر بار ہو۔

مولاناؒ کو دفتر "الہلال" سے یہ کیفیت معلوم ہوئی تو خواجہ مرحوم کو لکھا:

"میرے دلِ عقیدت کیش کے لیے تو اتنی نسبت بھی کافی ہے کہ "الہلال" آستانۂ مبارک تک پہنچے اور محروم واپس لوٹے، تاہم اس بے التفاتی کا سبب معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہوں"

اس مکتوب پر یہ شعر ثبت تھا:

خواہی کہ بہ تو بیش شود شوق نظیری
از پیش خودش گاہ براں، گاہ نگہدار

غرض مولاناؒ نے خواجہ مرحوم کو آمادہ کر لیا کہ وہ "الہلال" وصول کرتے رہیں اور اسے کسی سے پڑھوا کر سنتے رہیں۔

علامہ اقبالؒ نے الہلال کے چند نمبر دیکھے تو اس کی توسیع اشاعت کے لیے خاص اہتمام فرمایا۔ چنانچہ دو ماہ کے اندر اندر الہلال کے معاونین کی ایک فہرست ۹ اکتوبر کی اشاعت میں چھپی تھی، اس میں پہلا نمبر دہلی کے ایک بزرگ کا تھا جس نے نام شائع کرنے کی اجازت نہ دی (اور وہ یقیناً مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم و مغفور ہوں گے) جنہوں نے بارہ خریدار مہیا کئے، دوسرا نمبر علامہ مرحوم کا تھا، انہوں نے دس خریداروں کا انتظام کر دیا، یہ دوستانہ روابط کی تجدید تھی، اور اسے دعوتِ "الہلال" کی تائید و حمایت کا ایک روشن وثیقہ سمجھنا چاہیے، یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ علامہ مرحوم و مغفور رسائل و جرائد کے سلسلہ میں اس نوع کی سرگرمیوں کے عادی نہ تھے۔

نظم فاطمہ بنتِ عبداللہ

یہ بھی یقین ہے کہ علامہ "الہلال" کو بالالتزام پڑھتے تھے، ان کی ایک مشہور نظم فاطمہ بنت عبداللہ ہے، یہ تیرہ سال کی ایک عرب سید زادی تھی جو طرابلس کی ایک لڑائی میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی، اس بچی کی مفصل روداد پہلی مرتبہ "الہلال" ہی میں مع تصویر شائع ہوئی تھی اور اس روداد نے ہزاروں دردمندوں کو رُلایا تھا، حضرت علامہؒ کے قلب حساس پر جو قیامت گزر گئی ہو گی اس کا کسی قدر اندازہ فاطمہ پر نظم کے اشعار سے ہو سکتا ہے:

یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقّائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

فاطمہ! اگر شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تُربتِ خاموش میں
پَل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور
جو ابھی اُبھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو ناآشنا ہے قید صبح و شام سے
جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

البلاغ کی نظم

سنہ ۱۹۱۴ء میں "الہلال" اس لیے بند ہو گیا کہ دو ہزار کی ضمانت ضبط کر لی گئی تھی اور آئندہ کے لیے دس ہزار کی ضمانت مانگی گئی تھی۔ پھر مولاناؒ نے ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۱۵ء کو "البلاغ" جاری کیا۔ اس کے پہلے صفحہ پر حضرت علامہ کی وہ نظم شائع ہوئی جو "عرفی" کے زیرِ عنوان بانگِ درا میں شائع ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں بھی چند اُمور تھوڑی سی تفصیل کے محتاج ہیں۔

۱۔ اس ایک نظم کے سوا کوئی نظم "الہلال" دورِ اوّل یا البلاغ یا الہلال کے دورِ دوم کے پہلے صفحے پر کبھی شائع نہ ہوئی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولاناؒ کے نزدیک علامہ کا رتبہ کتنا بلند تھا۔

۲۔ "البلاغ" کے انتظامات مکمل کر لینے کے بعد یقیناً مولاناؒ نے علامہؒ کو لکھا ہوگا کہ کوئی نظم بھیجیے اور معلوم ہے کہ علامہ مرحوم بلا طلب کسی کو نظم بھیجنے کے عادی نہ تھے بلکہ اکثر کو اصرار و ابرام

پر بھی ناکامی ہوتی تھی۔

۳۔ اس نظم میں عرفی کے ایک مشہور شعر کی تضمین کی گئی ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

نوا را تلخ ترمے زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

اور البلاغ میں یہی مصرع اس نظم کا عنوان تھا۔

۴۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "البلاغ" ہی کے لیے کہی گئی تھی، کیونکہ اسے مولانا کے مقامِ دعوت سے خاص تعلق تھا۔

ضروری گزارش یہ بھی عرض کر دوں کہ تضمین کا ایک عام طریقہ یہ ہے کہ کسی شعر کے پہلے مصرع کا قافیہ سامنے رکھ لیا جائے اور اس پر مصرعے لگائے جائیں، لیکن حضرت علامہؒ کا طریقِ تضمین میرے نزدیک یہ تھا کہ شاعر نے جو کچھ دو مصرعوں میں کہہ دیا ہے اس کا پس منظر واضح کیا جائے تاکہ زیرِ تضمین شعر کے ضمن میں شاعر کے فکر و خیال کا پورا سلسلہ آشکارا ہو جائے۔

میری تحریر کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ اس شعر کے سلسلے میں حضرت علامہ نے اصل کیفیت کی توضیح فرما دی جو یہ شعر کہتے وقت عرفی کے دل میں موجزن تھی، مطلب صرف یہ ہے کہ اس شعر سے جو کیفیت حضرت علامہ کے قلب و دماغ پر طاری ہوئی اسے روشن اور پر تاثیر انداز میں پیش کر دیا:

اس تضمین کے پہلے دو شعروں میں عرفی کا مقام بتایا گیا ہے۔

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی

صاف ظاہر ہے کہ یہ اسی دور کے تاثرات ہیں جب حضرت نے فرمایا تھا۔ ؎

بادہ زن با عرفیٔ ہنگامہ خیز

پھر فرماتے ہیں:

مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی
مزاجِ اہلِ عالم میں تغیّر آگیا ایسا
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطف و بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیوں کر؟
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

یہ شکایت سن لینے کے بعد:

صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم گو
"نوارا تلخ ترمے زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمے خواں چو محمل را گراں بینی"

مقام دعوت سے آگاہی

ملاحظہ کیا آپ نے؟ اس تضمین نے عرفی کے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؛ پھر اس پوری نظم کو مقامِ دعوت سے کتنا گہرا تعلق ہے؟ چونکہ حضرت علامہ کا اپنا مقام بھی یہی تھا جیسا کہ خود "شمع اور شاعر" میں فرماتے ہیں:

صفتِ شمع لحد مُردہ ہے محفل میری
آہ! اے رات بڑی دُور ہے منزل میری
عہدِ حاضر کی ہوا راس نہیں ہے اس کو
اپنے نقصان کا احساس نہیں ہے اس کو
ضبطِ پیغامِ محبّت سے جو گھبراتا ہوں
ترے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

کمال دیکھئے کہ منزل سے مایوسی کا اظہار نہیں کیا صرف یہ کہا کہ میری منزل بہت دُور ہے۔ میرا کام بڑا کٹھن، صبر آزما اور مشقت خیز ہے، کیوں؟ اس لیے کہ میری قوم احساسِ زیاں سے محروم ہو کر مُردوں کی طرح سوئی پڑی ہے خُدا جانے کب بیدار ہو، کب اس کے رگ و پے میں خُون دوڑے، کب وہ سربازی اور جاں نثاری کے جذبہ سے سرشار ہو کر میدانِ عمل میں نکلے۔

پھر وہ صبح کی ہنگامہ آرائی کا منظر دیکھتے ہیں تو بے اختیار دل کی گہرائیوں سے یہ پیغام موجِ طوفان کی صورت اُٹھتا ہے۔

مسلمِ خوابیدہ اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر گرمِ تماشا تو بھی ہو

کبھی ان کی دعوت پُرخلوص دُعا بن جاتی ہے۔

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو گرما دے جو رُوح کو تڑپا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغِ محبّت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہم دوش ثریا کر!
خودداریِ ساحل دے، آزادیِ دریا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

غرض حضرت علاّمہ خود مقامِ دعوت میں تھے اور اس کے تقاضوں کو خُوب سمجھتے تھے انہوں نے اپنے ایک ہمسفر کو وہی پیغام دیا، جسے وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے یعنی مخاطبوں کی کم

ذوقی اور بے جوشی سے بے نیاز ہو کر عرفی کے اس مقصد پر کاربند رہنا چاہیے :

نوا را تلخ تر مے زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

حدی را تیز تر مے خواں چو محمل راگراں بینی

شکایت کا پہلا موقع بہر حال نومبر ۱۹۱۵ء تک دونوں دوستوں کے درمیان دمسازی و دل گرمی قائم تھی، میرے اندازے کے مطابق حضرت علامہ کو پہلی مرتبہ شکایت کا موقع اس وقت پیدا ہوا جب مولانا کی کتاب "تذکرہ" شائع ہوئی (۱۹۱۹ء)۔ اس کے دیباچے میں فضل الدین مرزا نے لکھ دیا تھا :

ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے اس کے مقابلہ میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے اور "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" فی الحقیقت "الہلال" ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔

یہ تحریر محض خلافِ واقعہ ہی نہ تھی ویسے بھی نہایت افسوسناک تھی، حضرت علامہ نے غالباً مولانا سید سلیمان مرحوم کو لکھا اور سید مرحوم نے یہ معاملہ مولانا تک پہنچایا جو اس سے تقریباً چار سال پیشتر رانچی میں نظر بند ہو چکے تھے۔ مولانا نے سید سلیمان مرحوم کو لکھا :

ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں، یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی، لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس "تذکرہ" کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں، مسٹر فضل الدین نے مقدمہ لکھ کر نظرِ ثانی کے لیے بھیجا تھا میں نے واپس نہ بھیجا اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کا پہلا حصہ شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ پوری کتاب شائع کر دی جائے، صرف اتنا ٹکڑا حدود درجہ ضمنی مطولات و عدم انضباط کی وجہ سے مکروہ ہوگا، خیال کیا کہ مقدمہ واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا، لیکن انہوں نے بعینہٖ چھاپ کر جلد باندھ کر یکایک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے، علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ والے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرزِ تحریر و استدلال

وغیرہ کے لحاظ سے بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ اس مرتبہ جب وہ جلسے کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیوں کر تبدیلی معلوم کی؟ تو خود میرے قول کا حوالہ دے دیا۔ جو کبھی کہا تھا۔ حالانکہ میں نے جو بات کہی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کے عامۃ الناس کے تصوّف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے ہیں اور دونوں مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں وہ وہی ہے جو ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔

ضروری نکتہ اس طویل اقتباس سے چند باتیں بالکل ظاہر ہیں۔

(۱) مولاناؒ کے نزدیک حضرت علامہ کا شکوہ بے جا نہ تھا۔

۲۔ مقدمہ نہ مولانا کا لکھا ہوا تھا، نہ وہ تذکرہ کو دو ٹکڑوں میں شائع کرنے پر راضی تھے۔ فضل الدین مرزا مرحوم نے مولاناؒ کی مرضی کے خلاف اسے چھاپا اور مقدمہ خود لکھا۔

۳۔ مولاناؒ کے نزدیک وہی ٹکڑا نہیں جس میں حضرت علامہ کا ذکر تھا بلکہ پورا مقدمہ طرز تحریر و استدلال کے لحاظ سے لغو تھا۔

۴۔ مولاناؒ نے یقیناً کسی موقع پر کہا تھا کہ حضرت علامہ مثنویوں میں وہی بات کہنا چاہتے ہیں جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں لیکن یہ انہوں نے کبھی نہ کہا کہ مثنویاں "الہلال" کی صدائے بازگشت ہیں۔ اور نہ ان کی یہ رائے تھی۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دوں کہ ہر فرد کے خیالات و افکار اور علم و نظر ارتقا پذیر رہتے ہیں محض حضرت علامہؒ ہی نہیں خود مولاناؒ کے افکار میں بھی کئی مرتبہ تبدیلیاں ہوئیں "الہلال" یا "البلاغ" کے دور کے بعض افکار بھی بعد میں بدل گئے تھے۔ یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ وسعتِ فکر و نظر کا تقاضا بھی یہ ہے۔ حضرت علامہؒ نے بانگ درا کی ترتیب کے وقت متعدد نظمیں بالکل چھوڑ دیں نیز بعض نظموں کے اشعار ترک کر دیئے اور بعض شعر یا مصرعے بدل ڈالے۔ یہ اسی حقیقت کی شہادت ہے کہ موصوف کے جانچنے کا پیمانہ بہت بلند ہو چکا تھا اور وہ ہر نظم یا ہر شعر کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق معیاری نہیں سمجھتے تھے۔ ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۸ء یا ۱۹۲۴ء کا اقبال ایک نہ تھا بلکہ ہر دور کا اقبال پہلے سے مختلف تھا۔ پھر آخری دور میں

اس محبوب شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے جو برتری عطا کی وہ پہلے کے کسی دور میں اسے نہیں ملی تھی، حالانکہ اقبالؔ ہر دور میں زیادہ سے زیادہ محبوب ہی رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۱ء میں بھی اس کی محبوبیت سب سے الگ تھی۔

سیاسی اختلافات اور گفتگو

علامہؒ اور مولانا کے درمیان ایک بڑا اختلاف ملک کے آئندہ سیاسی نظام کے متعلق پیدا ہوا جس نے میرے اندازے کے مطابق ۱۹۲۸ء میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ یہ اختلاف مولانا اور ان کے بعض نیازمندوں کے درمیان بھی تھا۔ تاہم میں ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ علامہؒ اور مولاناؒ میں اس وقت بھی خاصے خوشگوار دوستانہ روابط موجود تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ مولاناؒ اور ڈاکٹر انصاری مرحوم سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کو تقویت پہنچانے کے لیے لاہور آئے تھے تو نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم نے دوستانہ روابط کی بنا پر ان کے لیے "زرافشاں" میں شاندار دعوتِ طعام کا انتظام کیا تھا۔ اس میں چالیس پچاس اکابر مدعو تھے۔ جن میں حضرت علامہ بھی تھے۔ راقم الحروف کو بھی اس دعوت میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ حضرت علامہؒ نے پہلے سے مجھے تاکید کر دی تھی کہ کھانے پر مولانا کے پاس بیٹھنے کا انتظام کر لینا تاکہ تمام ضروری اُمور کے متعلق ان سے باتیں ہو جائیں۔ چنانچہ میں اور حضرت علامہؒ مولانا کے پاس بیٹھے۔ پوری گفتگو نہ یہاں دہرائی جا سکتی ہے اور نہ ہر بات محفوظ رہی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کھانے کے بعد اس گفتگو کے متعلق علامہؒ مرحوم کا تاثر خوشگوار نہ تھا۔ لیکن اس وقت تک گہرے دوستانہ روابط یقیناً موجود تھے۔ پھر میری معلومات کے مطابق دونوں کے درمیان ملاقات کی نوبت کبھی نہ آئی۔

اختلافات کی مثالیں

بہرحال یہ اختلاف ایک سیاسی معاملے کے باب میں تھا اور ایسے اختلافات علامہ مرحوم کو بعض دوسری بڑی شخصیتوں سے بھی پیش آتے رہے۔ مثلاً حضرت علامہ سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کے حامی تھے، قائداعظم مرحوم بائیکاٹ کے داعی تھے۔ اس پر مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی ایک کو مقامِ اجلاس کے اعتبار سے "لاہور مسلم لیگ" دوسری کو "کلکتہ مسلم لیگ" کہا جاتا تھا۔ حضرت علامہ اس ڈیلی گیشن میں بھی شامل تھے جس نے مسلم لیگ کی طرف سے لاہور کمیشن کے رُوبرو شہادت دی تھی اس زمانے میں مولانا حسرت موہانی مرحوم و مغفور سے بڑا انقلابی اور سامراج

کا دشمن کوئی نہ تھا۔ وہ بھی لاہور لیگ میں شامل اور کمیشن کے ساتھ تعاون کے حق میں تھے۔ قائداعظم مرحوم و مغفور بھی طویل مدت تک مخلوط انتخاب کے حامی رہے۔ حضرت علامہؒ نے کبھی اس طریقِ انتخاب کی مخالفت ترک نہ فرمائی۔

پھر حضرت علامہؒ مرحوم و مغفور حیاتِ مستعار کا دور ختم کر کے اپریل ۱۹۳۸ء میں عالم بقا کی طرف رحلت کر گئے۔ اس وقت تک آئندہ کے لیے کوئی مستقل پروگرام طے نہیں ہوا تھا۔ مولاناؒ نے مزید بیس سال خاکدانِ ارضی میں گزارے۔ کوئی شخص وثوق و قطعیت سے نہیں کہہ سکتا کہ حضرت علامہ مرحوم بھی مزید نو دس برس زندہ رہتے تو ملتِ اسلامیہ کے عمومی سود و بہبود کے پیشِ نظر ان کی رائے کیا ہوتی یا تقسیم کا جو خاکہ انھوں نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ صدارت میں پیش کیا تھا وہی تھا، جس کے مطابق بعد میں عمل ہوا۔ جن صاحب کو اس سلسلے میں یقین و وثوق ہو وہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کی رائے صحیح نہ تھی، اور راقم الحروف ان لوگوں میں سے ہے جس نے اس رائے کی سخت مخالفت کی تھی۔

فیصلے کے بعد کا دور جب آخری فیصلہ ہو چکا تو میرے اندازے کے مطابق مسلمان فکر و عمل کے اعتبار سے مختلف جماعتوں میں منقسم تھے۔

۱۔ پہلے سے بہت بڑی اکثریت تقسیم کی حامی تھی، اگرچہ ان میں سے اکثر کو منظور کردہ خطِ تقسیم کا وہم و گمان بھی نہ تھا اور وہ صوبوں کی تقسیم سے بالکل خالی الذہن تھے۔ بیشتر نے اسے چپ چاپ قبول کر لیا۔ ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں موجود تھے جن کے نزدیک مجوزہ خط کی منظوری سراسر تعجب انگیز اور مصیبت خیز تھی، انہیں میں مولانا حسرت موہانی مرحوم بھی تھے لیکن حالات نے یکایک ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ وہ لوگ اپنا نقطۂ نگاہ منظرِ عام پر بھی نہ لا سکے۔

۲۔ ایک جماعت ایسی تھی جس نے تقسیم کی سخت مخالفت کی تھی، مگر بہت بڑی اکثریت کا فیصلہ تقسیم کے حق میں صادر ہوا تو وہ خاموش ہو گئے۔ زیادہ تر اس خیال سے کہ جو اصحاب تقسیم کے ذمہ دار ہیں وہ بیان کردہ مقاصد کے مطابق قوم و ملک کی تعمیر کا کام بے خرخشہ انجام دے سکیں۔

۳۔ ایک بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو تقسیم میں حدود پاکستان سے باہر رہ گئی تھی، مگر سکھوں

اور ہندوؤں نے انہیں صدیوں کے وطنوں سے اُٹھا کر باہر نکال دیا۔ جنوبی و مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال نیز ریاست ہائے پنجاب کے مسلمان اسی طرح پاکستان میں دھکیلے گئے۔

۴۔ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو خود بخود مشرقی یا مغربی پاکستان میں پہنچ گیا۔ ان کے مقاصد کے متعلق یہاں بحث کی ضرورت نہیں۔

۵۔ ایک جماعت ایسی تھی، جس کے لیے ہندوستان میں حالات سخت ناخوشگوار ہو گئے تھے۔ اور اب تک ناخوشگوار ہیں، لیکن ان کے لیے یہاں آنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

۶۔ ایسے لوگ بھی تھے جو تقسیم کے حق میں نہ تھے مگر قوم کا فیصلہ اُن کے خلاف صادر ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی جگہیں نہ چھوڑیں، تلخیاں اور ناخوشگواریاں صابرانہ برداشت کیں اور ہندوستان میں متفرق و مضطرالحال مسلمانوں کے لیے ہر ممکن اطمینان و دل جمعی کا سہارا مہیا کرنے کی کوششیں جاری رکھیں جن کی تعداد آج بھی پانچ اور چھ کروڑ کے درمیان ہے ان میں سے ایک آزادؒ تھے، جن کی زندگی کے آخری نو دس سال کاملاً اسی سعی و جدوجہد میں بسر ہو گئے۔

دو باتیں

یقیناً مولاناؒ کے نقطہ نگاہ اور صواب دید سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ اس باب میں ان کی رائے تھی، لیکن دو باتیں نظر انداز نہ کرنی چاہئیں۔

۱۔ اگر خط تقسیم پورے صوبوں پر بھی حاوی ہوتا اور انہیں چیر پھاڑ سے محفوظ رکھا جاتا تو اس صورت میں بھی مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد ہندوستان کے اندر رہ جاتی۔ کیا ان کے تحفظ کی امکانی کوششیں ضروری نہ تھیں؟ جن لوگوں نے یہ کوششیں امکانی حد تک انجام دیں، کیا ان کا صلہ ہماری طرف سے مذمت کے سوا کچھ نہ ہونا چاہیے؟

۲۔ سیاسی آرا و تجاویز سے قطع نظر کرتے ہوئے مولانا کو قدرت نے ایسے فضائل و مکارم سے شرف بخشا تھا جن کی مثالیں یقیناً کبھی عام نہ ہوئیں۔ کیا عدل کا تقاضا یہ نہیں کہ ہم جو کچھ کہیں ان میں حقیقی حدود کا لحاظ بہرحال رکھیں۔

ہندوستان کے مسلمان

یہ بھی واضح ہے کہ سیاسی آرا کی درستی و نادرستی کا بھی ٹھیک ٹھیک

موازنہ اس وقت نہیں کیا جاسکتا جب تک مقاصدِ تقسیم معیّن عملی صورت میں سامنے نہ آجائیں، جو مسلمان اس وقت ہندوستان میں ہیں ان کی تعداد جمہوریہ ترکیہ جمہوریہ متحدہ عرب اور ایران کی مجموعی آبادی سے کم نہیں جن لوگوں کو اتنی بڑی اسلامی آبادی کے سود و بہبود سے کچھ بھی دلبستگی ہے، وہ محض یہ کہہ کر اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہوسکتے کہ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں، غور کرنا چاہئے کہ بندگانِ خدا کی اتنی بڑی جمعیّت کو دائرہ اسلام میں لانے کے لیے کتنا وقت اور کتنے وسائل درکار ہیں اور ان کے تحفظ کے لیے زیادہ معقول، زیادہ مثبت، زیادہ محکم اور مؤثر تدابیر اختیار کرنا ہمارے اوّلین واجبات میں سے ہے۔ الفاظ کے ان شعلہ انگیز مرقعوں سے یہ کام سرانجام نہیں پاسکتا جو وقتاً فوقتاً مقالوں یا بیانوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں:

ہمارا فرض سب سے آخر میں یہ کہ حضرت علامہؒ اور مولانا آزادؒ کے درمیان اختلافات کو قیاساً بڑھانے یا پھیلانے سے ہمارا کون سا داخلی یا خارجی مسئلہ حل ہوسکتا ہے؟ دونوں بزرگ اس بارگاہ میں پہنچ گئے جو انسانی اعمال کی حقیقی محاسب ہے اور جہاں ثواب و عذاب کے فیصلے کئے جاتے ہیں ہم میں سے کسی کو بھی وہاں دخل کی مجال نہیں، اگر تقسیم ہی وجہ اختلاف تھی تو وہ ہوچکی۔ اب تو تمام تر توجہ ان اُمور کے لیے وقف ہونی چاہیے جو تقسیم سے پیدا ہوئے یا جو ہمارے نزدیک مقاصدِ تقسیم تھے کسی خاص مقام پر حدود کا خط لگوالینا تو بجائے خود کچھ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اصل شے یہ تھی کہ ہم نے کن بلند ارادوں کے پیشِ نظر تقسیم ناگزیر سمجھی تھی اور ان بلند ارادوں میں سے کتنے اب تک معیّن و محکم عملی صورت اختیار کرچکے ہیں؟ اسی پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ اسی پر ہماری قومی بہبود و فلاح کا مدار ہے۔ یقین کیجیے کہ علامہ اقبالؒ اور مولانا آزادؒ یا دوسری شخصیتوں کے اختلافات کی حدیں معیّن کرنا سلبی اعتبار سے بالکل بے نتیجہ ہے۔ ایجابی نقطۂ نگاہ سے تو صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہم اپنی فروماندگی فکر و نظر اور فقدانِ عزم و عمل پر پردے ڈالنے کے لیے سرمشق اضطراب بنے ہوئے ہیں یہ صورتِ حال ایسی ہے کہ ناسور رخسار پر ہو اور مرہم پاؤں پر لگایا جائے یا آگ گھر میں لگی ہوئی ہو اور پانی راستے پر چھڑکا جائے اس طرح نہ ناسور اچھا ہوگا اور نہ آگ بجھے گی۔

ارمغانِ حجاز کی ایک رُباعی کا معاملہ

"سرور" یا "سرود"

حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" کے صفحہ ۱۴ پر ایک رباعی (یا شعر گوئی کی مسلمہ اصطلاح کے مطابق ایک قطعہ) یُوں درج ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

یہ رباعی میں نے پہلی مرتبہ راجا حسن اختر مرحوم کی زبان سے اس روز سنی تھی جس روز حضرت علامہ مرحوم راہگرائے عالم بقا ہوئے تھے اور اس وقت ان کی میّت کو غسل بھی نہیں دیا گیا تھا۔ میں، راجا صاحب اور بعض اور اصحاب "جاوید منزل" کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ حضرت کا انتقال چھ بجے صبح کے قریب ہوا تھا اور راجا حسن اختر اس سے ڈیڑھ دو گھنٹے پیشتر کی کیفیت سنا رہے تھے انھوں نے کہا کہ میں پھرتے پھراتے آیا اور باہر کے ایک کمرے میں پڑی ہوئی چارپائی پر سو گیا۔ علی بخش نے مجھے جگا دیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب (علی بخش ہمیشہ مرحوم کو ڈاکٹر صاحب یا شیخ صاحب ہی کہا کرتا تھا، یاد کر رہے ہیں۔ میں حاضر ہُوا تو فرمایا کہ حکیم قرشی صاحب کو بُلا لائیے۔ راجا صاحب

کہتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ قرشی صاحب رات کے بارہ بجے گھر گئے ہیں ذرا صبح ہو جائے تو میں بلا لاؤں گا۔ فرمایا: رات جس تکلیف میں گزری ہے اس کی کیفیت بیان کرنا مشکل ہے۔

یہ سنتے ہی راجا صاحب جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وقت حضرت نے یہ رباعی سنائی اس میں "سرود رفتہ" ہی پڑھا تھا کیونکہ حضرت کی زبانِ مبارک سے یہی سنا تھا پھر یہ رباعی اس زمانے (اپریل ۱۹۳۶ء یا بعد) کے جرائد و رسائل میں شائع ہوئی سب نے "سرود" ہی چھاپا بلکہ اس کی تضمین بھی کی گئی۔ "سرور" کہیں نہ دیکھا۔

"ارمغانِ حجاز" زیرِ طبع تھی تو ایک روز چودھری محمد حسین مرحوم و مغفور نے مجھ سے ذکر کیا کہ "سرود" ہونا چاہیے یا "سرور"۔ میں نے کہا کہ زیادہ موزوں "سرود" ہی معلوم ہوتا ہے نہ کہ "سرور"۔ غالباً میں نے کچھ حوالے بھی دیے تھے جن کی صحیح کیفیت اس وقت یاد نہیں آتی۔ چودھری صاحب کی گفتگو سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ انھیں تحریر شدہ رباعی دیکھ کر اشتباہ ہوا تاہم مجھے یقین تھا کہ "ارمغان" میں "سرود" ہی چھپا ہے۔

گزشتہ تیئس سال میں "ارمغان حجاز" خدا جانے کتنی مرتبہ پڑھی۔ یہ رباعی یا بعض دوسری رباعیاں، جو یاد تھیں، آتیں تو کتاب دیکھے بغیر ہی پڑھ کر آگے نکل جاتا کبھی غور سے نہ دیکھا کہ کیا چھپا ہے۔

کئی احباب نے ذکر کیا کہ "ارمغان" میں "سرور" چھپا ہے میں بتاتا رہا کہ یہ غلط ہے لیکن خود غلطی پر متنبہ نہ ہوا۔

پچھلے دنوں ارمغان کی کاپیاں پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اس میں "سرور" دیکھ کر میں نے کتاب کا پہلا ایڈیشن نکالا اور دیکھا تو اس میں بھی "سرور" ہی تھا۔ میں نے عزیز مکرم ڈاکٹر جاوید اقبال سے بھی ذکر کیا لیکن ان کا تاثر بھی بظاہر یہی تھا کہ پہلے ایڈیشن

میں "سرور" "سرود" ہی ہے۔

سب سے پہلے یہ رباعی راجا حسن اختر مرحوم نے حضرت کی زبان مبارک سے سن کر سنائی تھی تو "سرود" ہی سنا یا نہ کہ "سرور" اور راجا صاحب "سرود" و "سرور" میں امتیاز کی صلاحیت سے بوجہ اتم بہرہ مند تھے پھر "سرور" اصل رباعی میں معنویت کے ان تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہو سکتا تھا جو بظاہر حضرت علامہ کے پیش نظر تھے اس میں صحیح "سرود" ہی تھا۔ نیز لکھتے وقت "ر" اور "د" میں اشتباہ غیر اغلب نہ تھا اور غالباً دوسری رباعیوں کی طرح یہ رباعی بھی حضرت مرحوم نے اپنے دست مبارک سے نہیں لکھی تھی، کسی سے لکھوائی تھی۔ یہ معلوم نہیں کس سے؟ نہیں کہا جا سکتا کہ ان صاحب نے ایک ایک لفظ ٹھیک ٹھیک سنا اور ٹھیک ٹھیک لکھا یا تحریر میں "د" اور "ر" کا فرق واضح طور پر ملحوظ رکھا۔

ایک قدم اور آگے بڑھائیے یہ موقع اور محل "سرود" کا تھا جس سے مقصود احیاء ملت و احیاء اسلامیت کی دعوت تھی۔ "سرور" کا نہ تھا جس کا تعلق انسان کی داخلی اور اندرونی کیفیت سے ہے اور اسے بعید سی توجیہات کے بعد بھی "دعوت" کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔

حضرت علامہ نے "سرود"، "نوا"، "بانگ" یا "بانگ درا" دعوت کے لیے جا بجا استعمال کیے ہیں بلکہ "سرود رفتہ" اور "نواہائے رفتہ" کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے　　رہبر ہے قافلوں کی تاب جبیں تمھاری

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں　　جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری　　نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو　　لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا　　غیرِ یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

گوش آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا تیرا　　اور کول ہنگامۂ حاضر سے بے پروا تیرا

(بانگِ درا ص ۲۱۶)

تیرے سرودِ رفتہ کے نغمے علومِ نو　　تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد

(بانگ درا ص ۲۴۸)

غزل سرائے و نوا ہائے رفتہ باز آور　　برایں فسردہ دلاں حرف دل نواز آور

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بدیہی حقایق کے ہوتے ہوئے سرودِ رفتہ کو کیوں ترجیح دی گئی حالانکہ خاص اس مقام پر سرودِ رفتہ کی موزونیت ہی نہیں جواز کا معاملہ بھی محل نظر ہے۔

سب سے آخر میں یہ کہ یہ حضورِ حق کے باب کی بائیسویں رباعی ہے اور تئیسویں رباعی جو اس کے بعد آتی ہے، اس کے مضمون کا تکملہ ہے یعنی جو کچھ حضرت مرحوم کہنا چاہتے تھے اس کی ابتدا بائیسویں رباعی سے ہوئی اور تئیسویں رباعی میں اسے پورا کیا۔ وہ رباعی ملاحظہ فرمائیے:

اگر مے آید آں دانائے رازے
بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیر امتاں را مے کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

آپ سوچیں کہ جب تک پہلی رباعی میں "سرود" نہ پڑھیں گے نوائے دل گداز ے اور حکمے نے نوازے کے لیے کس طرح اور کیوں کر گنجائش پیدا ہو گی ؟ یہ دونوں ٹکڑے "سرور" پڑھنے سے تو سراسر غیر موزوں اور بے محل ٹھہریں گے۔

گویا حضرت مرحوم کہنا یہ چاہتے تھے کہ میرا دور تو اختتام کو پہنچ گیا۔ اب معلوم نہیں کوئی دانائے راز آتا ہے یا نہیں آتا۔ سرودِ رفتہ دوبارہ سنائی دیتا ہے یا نہیں۔ حجاز مقدس سے نسیم کا کوئی جھونکا آتا ہے یا نہیں آتا۔ پھر فرماتے ہیں اگر کوئی اور دانائے راز آئے تو اے باری تعالیٰ تو اپنی رحمت سے اسے دل گداز نوا عطا کر، کیونکہ امتوں کے ضمیر کو آلایشوں سے پاک کرنے کا کام یا تو کسی کلیم اللہ کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے یا کسی ایسے حکیم کے ہاتھوں جو نے نواز ہو۔

آخر دوسری رباعی کو پہلی سے متعلق نہ رکھنے کی صورت اس کے سوا کیا ہے کہ "سرور" کی جگہ "سرود" رکھا جائے اور یقیناً حضرت علامہ نے "سرود" ہی لکھا تھا مگر وہ نامعلوم اسباب کی بنا پر "سرور" بن گیا۔

غرض گزارش یہ ہے کہ "سرور رفتہ" وہاں کسی بھی اعتبار سے موزوں نہیں خدا جانے یہ کس طرح راستہ پا کر وہاں پہنچ گیا جن جن اصحاب نے مختلف اوقات میں مجھ سے "سرور" کا ذکر کیا میں یہی کہتا رہا کہ وہاں بالکل نامناسب و غیر موزوں ہے بلکہ خاص اس مقام پر "سرور" کو بے معنی قرار دینے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے، کیونکہ اس کی وجہ سے نہ اس رباعی کی معنویت حقیقۃً جلوہ گر ہو سکتی ہے اور نہ اگلی رباعی سے اس کا رشتہ و رابطہ قائم ہو سکتا ہے یہاں "سرود رفتہ" تھا اور وہی رہنا چاہیے۔

امید ہے کہ ارباب فکر و نظر اس عاجزانہ گزارش پر خاص توجہ مبذول فرمائیں گے تاکہ غلطی کی اصلاح ہو جائے اور "سرور" کی جگہ "سرود" کو دے دی جائے جو

اس جگہ کا حقدار ہے[1]

اقبال ریویو کراچی۔
جنوری ۱۹۶۹ء

---

[1] مقامِ مسرت ہے کہ اہل علم کی ایک محفل نے جس کا انتظام شیخ نیاز احمد (شیخ غلام علی اینڈ سنز) نے ڈاکٹر جاوید اقبال بیرسٹرایٹ لا کے مشورے سے کیا تھا، بالاتفاق قرار دیا کہ رباعی میں "سرود" ہی درست ہے نہ کہ "سرور" اور آیندہ کے لیے ارمغان حجاز کی اس رباعی میں "سرود" بنا دینے کا فیصلہ ہو گیا۔ نیز ایک روز سید نذیر نیازی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ رباعی میں نے لکھی تھی اور اس میں "سرود" ہی تھا۔ معلوم نہیں "سرور" کیوں کر بن گیا۔ یہ بھی بتایا کہ حضرت علامہ نے وفات سے قریباً دس روز پیشتر وہ رباعی کہی تھی جو "سرود" والی رباعی کا تتمہ ہے یعنی:

اگر مے آید آں دانائے رازے
بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیر انساں را مے کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

اس کے بعد کچھ نہ فرمایا۔ گویا یہ حضرت کا آخری کلام تھا۔

شکوۂ اقبالؒ اور جلسۂ انجمن

میں جس سال اسلامیہ کالج میں داخل ہوا تھا، اسی سال حضرت اقبال مرحوم نے انجمن کے سالانہ اجلاس میں اپنی شہرۂ آفاق نظم شکوہ پڑھی تھی۔ (اپریل ۱۹۱۱ء)

"تصویرِ درد" پڑھنے کے بعد ولایت چلے گئے تھے، وہاں سے ۱۹۰۸ء میں لوٹے، لیکن پیہم تقاضوں ——— اور التجاؤں کے باوجود انجمن کے اجلاس میں نظم پڑھنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ۱۹۱۱ء کے سالانہ اجلاس سے پیشتر ہی عام شہرت ہو گئی تھی کہ علامہ اس سال ضرور نظم پڑھیں گے۔ ہمارے اساتذہ میں سے پروفیسر خواجہ دل محمدؐ مرحوم وقتاً فوقتاً حضرت علامہ کے ہاں جایا کرتے تھے اگرچہ وہ کالج میں ریاضی کے پروفیسر تھے مگر شعر بھی کہتے تھے۔ اور چھوٹے بڑے مقامی جلسوں میں لَے سے نظمیں بھی سُنایا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ذکر فرمایا کرتے تھے کہ اقبال اس مرتبہ "شکوہ" کے نام سے ایک نظم لکھ رہے ہیں، بلکہ ایک مرتبہ اس نظم کا یہ شعر بھی سُنایا تھا۔ ؎

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالؓ حبشی رکھتے ہیں

ظاہر ہے کہ اس ایک شعر سے نظم کی حقیقی حیثیت کے متعلق کیا اندازہ ہو سکتا تھا خصوصاً مجھے ایسے شخص کو جو سکول کی تنگ فضا سے نکل کر کالج میں پہنچا تھا اور اس وقت تک ادبیات کی ابجد شناسی کا بھی شعور پیدا نہیں ہُوا تھا۔

اجلاس کی عمومی کیفیت

اس سال انجمن کا سالانہ اجلاس ریواز ہوسٹل کے صحن میں ہوا تھا۔ آج کل ہوسٹل کی جو کیفیت ہے اس کا مجھے علم نہیں، لیکن میری طالب علمی کے زمانے میں اس کا صحن چار حصّوں میں منقسم تھا،

ایک سڑک جس کا فرش پختہ اینٹوں سے بنا تھا داخلے کے دروازے سے سیدھی اس دروازے کی طرف جاتی تھی جس کے بعد باورچی خانے، ڈرائینگ ہال وغیرہ تھے۔ اسے کاٹتی ہوئی ایک سڑک دونوں طرف کے کمرے کو ملاتی تھی۔ سامنے کی عمارت دو منزلہ تھی۔ اس میں اوپر نیچے کیوبیکل تھے اور آگے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ دائیں بائیں ڈارمیٹریاں تھیں جن میں چھ چھ طالب علم رہتے تھے۔ سامنے کے حصّے میں ہاف ڈارمیٹریاں تھیں۔ وہ تین تین طالب علموں کے لیے تھیں۔ یہ سب ایک منزل کی تھیں اور ہم گرمیوں میں ان کی چھت پر سویا کرتے تھے۔ صحن کے چاروں پلاٹوں میں گھاس لگی ہوئی تھی جو وقتاً فوقتاً کٹتی رہتی تھی۔

حضرت علّامہ مرحوم

جلسے کے لیے اسٹیج دائیں جانب کے پچھلے پلاٹ میں بنائی گئی تھی جس کے عقب میں ہاف ڈارمیٹریاں تھیں۔ حضرت علّامہ تشریف لائے۔ میں نے دُور سے تو پہلے بھی دو تین مرتبہ دیکھا تھا، قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقعہ تھا وہ شلوار اور چھوٹا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ خاصی مدّت تک ان کا یہی لباس رہا۔ بعد میں ترکی ٹوپی کی بجائے وہ ٹوپی پہننے لگے تھے جسے ابتدائی دور میں مصطفےٰ کمال کیپ کہا جاتا تھا۔

علّامہ نے سب سے پہلے ایک قطعہ تحت اللفظ پڑھا جس کا آخری شعر یہ تھا۔ ؎

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں اُستاد کوئی

یہ قطعہ اس دور کے تمام اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو گیا۔ "مخزن" نے اسے مئی ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں چھاپا تھا اور ابتدا میں نوٹ لکھا تھا کہ حضرت اقبالؒ نے یہ قطعہ نظر ثانی کے بعد اشاعت کی غرض سے مرحمت فرمایا ہے۔

نظم کی رونمائی

اس کے بعد اصل نظم کی باری آئی۔ حضرت علّامہ نے بیشتر انجمن کے جلسوں میں جتنی نظمیں پڑھی تھیں۔ انہیں خود چھپوا کر لاتے

تھے لیکن "شکوہ" چھپوایا نہیں تھا۔ سب سے پہلے نظم کی رُونمائی کا سوال پیدا ہوا۔ نظم جن کاغذوں پر لکھی گئی تھی، ان کے لیے رونمائی کے طرز پر مختلف اصحاب نے مختلف رقمیں پیش کیں۔ جس حد تک مجھے یاد ہے نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم نے ایک سو روپے کی رقم کا اعلان فرمایا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ موجودہ دور میں اس کی گراں بہائی کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور کوئی چاہے بھی تو اس کے لیے اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ سنہ ۱۹۱۱ء کے ایک سو روپے آج کل کے ایک سو روپے میں کم از کم ایک اور سو کی نسبت ضرور ہے۔ یہ رقم ادا کرنے کے بعد نواب صاحب نے اصل نظم انجمن ہی کی نذر کر دی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا یہ انجمن کے محافظ خانے میں موجود ہے یا نہیں۔

حاضرین کی التماس علامہ مرحوم نظم پڑھنے کے لیے تیار ہوئے تو مختلف سمتوں سے صدائیں بلند ہوئیں کہ نظم گا کر پڑھی جائے کیونکہ پیشتر حضرت مرحوم نے جتنی نظمیں انجمن کے جلسوں میں پڑھی تھیں گا کر ہی پڑھی تھیں اور ان کی لَے میں جو سحر انگیز جاذبیت تھی اس کی کیفیت بھی بیان میں نہیں آ سکتی۔ آئندہ سال یعنی سنہ ۱۹۱۲ء میں شمع اور شاعر پڑھی تو وہ بھی گا کر ہی پڑھی تھی۔ لیکن حضرت علامہ نے فرمایا کہ میں خود ہی بہتر سمجھتا ہوں کہ نظم گا کر پڑھنی چاہیے یا تحت اللفظ۔ یہ نظم ایسی ہے کہ جو گا کر پڑھی نہیں جا سکتی۔ یعنی اس کے پڑھنے کا حق اس طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد نظم شروع ہو گئی۔ ایک بند سن لینے کے بعد سب کو یقین سا ہو گیا کہ حضرت علامہ ہی کا ارشاد درست تھا۔ کیونکہ پھر گانے کی التجا پر مشتمل کوئی صدا کسی سمت سے نہ اٹھی۔

پڑھنے کا سرسری نقشہ حضرت علامہ نظم پڑھتے جاتے تھے اور پورا جلسہ جو ہزاروں افراد پر مشتمل تھا بالکل حیرت زدہ سا معلوم ہوتا تھا۔ وقتاً فوقتاً واہ وا کی صدائیں بلند ہوتی تھیں اور دل سے اس بابرکت وجود گرامی کے لیے دُعائیں نکلتی تھیں جسے مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کے ایک نہایت نازک دور میں زندگی نو کی داغ بیل

دال دینے کا کام سپرد کیا تھا۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ جب حضرت علامہ مرحوم نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے

تو آخری مصرعے کے ساتھ ہی وہ اپنے اصل مقام سے آگے بڑھ گئے تھے اور اس حسنِ ادا سے کہ پوری مجلس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ پوری نظم کے غالباً اکیس بند تھے اسے پڑھنے میں خاصا وقت صرف ہو گیا تھا۔ لیکن مجمع پر ایسی حالت طاری تھی کہ اگر یہ نظم کئی گھنٹے بھی لے لیتی تو کوئی فرد ایک لمحہ کے لیے بھی نہ اکتاتا بلکہ یہی کہتا کہ نظم اور بھی لمبی ہو جانی چاہیئے

شکوہ کے سہ گونہ وظیفے حضرت علامہ پیشتر ایسی نظمیں پڑھ چکے تھے جن کی وجہ سے ہزاروں افراد مسحور ہو چکے تھے۔ لیکن شکوہ کی شان اور حقیقت سب سے الگ تھی اور یہ آج بھی ایک معجز نما نظم ہے۔

شکوہ کا نام سُن کر ہر قلب میں طبعاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر سے کہا گیا ہو گا کہ آپ کی بارگاہ سے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ کسی بھی نقطۂ نظر سے خوشگوار نہیں سمجھا جا سکتا اور شکوے پر مبنی نظم بحیثیت مجموعی خاصی افسردگی اور یاس ہی پیدا کی سکتی تھی لیکن اقبال کے فطری کمالات کا یہ عجیب و غریب مظاہرہ ہے کہ پوری نظم کہیں بھی دل پر افسردگی طاری نہیں کرتی بلکہ برابر حوصلہ بڑھتا رہتا ہے بہت تازگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اپنے ملّی کارناموں کی عظمت کا احساس زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔

نظم پر مستقل بحث کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا عرض کر دوں کہ یہ بیک وقت تین وظیفے ادا کرتی ہے۔

اسلامی کارنامے مسلمانوں کے نادر روزگار کارناموں کی سرگزشت سُناتی ہے۔

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟ شہرِ قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی کس کی تکبیر سے دنیا تیری بیدار ہوئی
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

بنیادی اسلامی قدریں

پھر دیکھئے تمام کارنامے ایسے چنے جن سے اسلام کی بنیادی اور اساسی قدریں آشکارا ہوتی تھیں، مثلاً توحید للّٰہیت بے پناہ جذبہ جہاد، شانِ مساوات و اُخوت، نوعِ بشر کی آزادی و خوشحالی، باطل کا مٹا دینا، قرآن مجید کو سینوں سے لگانا، کعبے کو جبینوں سے بسانا صرف خدا کے نام پہ اور صرف خدا کے لیے تلوار اٹھانا، خدمتِ حق کے مقابلے میں زر و مال سے بے نیازی، یہ اور اس انداز کی جتنی قدریں تھیں، وہ نہایت بدیع اور دلپذیر انداز میں پیش کیں۔ میں مثالیں پیش کروں تو پورا شکوہ یہاں مختلف عنوانوں کے تحت دہرانا پڑے۔

نادیدہ انداز

(۲) "شکوہ" کا دوسرا وظیفہ یہ ہے کہ کوئی واقعہ ایسا پیش نہیں کیا جو مستند تاریخی حقائق پر مبنی نہ ہو، اور جس نوع

کے واقعات سے ہماری ملّی سرگزشت کے صفحات برابر جلوہ زار نہ بنے ہوئے ہوں، لیکن ان تمام واقعات کو ایسے انداز میں ترتیب دیا کہ شکوے کا پہلو خود بخود نمایاں ہو رہا ہے اور کہیں بھی اس کی تصریح کے لیے دوسرا یعنی منفی پہلو مثبت اُسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

تقابل مقصود نہیں، صرف حکایۃً "خواجہ حالی مرحوم کا "شکوہ ہند" سامنے رکھ لینا کافی ہے۔ اس میں جابجا مسلمانوں کی بربادی کا ذکر آیا ہے اور یقیناً اس قسم کے تصریحی بیانات سے طبیعتوں پر افسردگی اور پژمردگی ہی طاری ہوتی ہے جو اخوّت عمل کے لیے بہرحال مہلک ہے۔ اقبال کے فکر و نظر کا کمال یہ ہے کہ صرف اثباتی پہلو پیش کر کے شکوے کا مقصد پورا کر دیا، سلبی و منفی پہلو شاید چند مصرعوں میں آیا ہے، لیکن اس طرح کہ اس میں دعائیہ رنگ پیدا کر کے افسردگی کا سدِّباب کر دیا گیا ہے، مثلاً۔ ؎

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری رحمت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب

بے مثال دعوتِ عمل

(۳) تیسرا اور نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ شکوہ اسلامی کارناموں کی ایک سرگزشت بھی ہے، اس سے شکوے کا کام بھی لیا گیا ہے اور آخر میں وہ مسلمانوں کے لیے دعوت عمل بھی ہے اور ایسی دعوتِ عمل جو حساس قلوب میں محشر خیز جوش اور والہیت پیدا کر دیتی ہے۔

یعنی مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ ایسے ہی کارنامے اور ایسے ہی انداز میں انجام دینے سے امامت کا منصبِ بلند ہاتھ آسکتا ہے جس پر ہمارے اسلاف صدیوں تک فائز رہے۔ اگر اپنی میراث حاصل کرنا چاہتے ہو تو ویسے ہی بن جاؤ جیسے تمھارے اسلاف تھے، انھی کے نقش قدم پر چلو اور از سرِ نو اقوامِ عالم کے سرتاج بن جاؤ۔

دعائیہ اشعار

شکوے کے آخری اشعار میں زیادہ تر دُعا کا رنگ ہے اور دُعا بھی ایسی

جس کی تاثیر کا اندازہ کرنا مُشکل ہے، مثلاً

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں.؟
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟
اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو سامانِ جگر سوزی دے
مُشکلیں اُمّتِ مرحُوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایاب محبّت کو پھر ارزاں کر دے
یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جو تپد خوں مے چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
مے تپد نالہ بہ نشتر کدہ سینۂ ما

غرض "شکوہ" اقبال کی نظموں میں بھی اپنے اوصاف و خصائص کے اعتبار سے ایک بے مثال نظم ہے۔ یہ سنہ ۱۹۱۱ء میں پڑھی گئی تھی۔ میں نے ستاون اٹھاون سال پیشتر کی دھندلی سی یادوں کی بنا پر یہ داستان اختصاراً عرض کر دی ــ تفصیلات دفتر کی محتاج ہیں۔ نظیری سچ کہہ گیا ہے: ؎

ہمیں عشق است برخود چیدہ چندیں داستاں ورنہ
کسے از معنیٔ یک حرف صد دفتر نمے سازد

ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" لاہور
(۲۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

خضر راہ

اقبال اکیڈمی کو حضرت علامہ اقبال کے متعدد خطوط ملے گئے جو مولانا گرامی کے نام تھے۔ ان کی ترتیب و تحشیہ کا کام مولوی عبداللہ قریشی کو سونپا گیا تھا۔ ان خطوط میں ایک خط ایسا بھی تھا جس میں مولانا گرامی نے حسبِ روایت خان نیاز الدین خاں علامہ کی نظم "خضر راہ" کے متعلق ایک عجیب رائے ظاہر کی تھی۔ حضرت علامہ نے مولانا گرامی کو تحریر فرمایا:

"کل نیاز الدین خاں صاحب کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ نظم "خضر راہ" آپ کو پسند نہیں اور آپ کی رائے میں اس کے تمام اشعار بے لطف ہیں اور بعض غلط۔ غلط اشعار کے متعلق تو میں فی الحال عرض نہیں کرتا، آپ مجھے اغلاط سے آگاہ فرمائیں گے تو عرض کروں گا۔ باقی آپ کے اعتراض کا پہلا حصہ صحیح ہے مگر یہ اعتراض گرامی کے شایانِ شان نہیں اگر کوئی اور آدمی اعتراض کرتا تو مضائقہ نہ تھا۔ یہ اعتراض منصور کے لیے شبلی کا پھول ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نظم کا بیشتر حصہ خضر کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ جس کی نظر حقایق واقعی پر جمی رہتی ہے۔ اس کے کلام میں اگر تخیل کی رنگینی ہو تو فرض رہنمائی ادا کرنے سے قاصر رہے گا۔ پس اس کلام میں پختگی اور حکمت تلاش کرنی چاہیے نہ تخیل اور خاص کر اس حالت میں جب کہ اس سے ایسے معاملات میں رہنمائی طلب کی جائے

جن کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو..... ان رموز کو
آپ سے بہتر کون جانتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نیاز الدین خاں
صاحب نے آپ کا اعتراض سمجھنے میں غلطی کی ہے۔"

حضرت علامہ نے صرف ایک واضح پہلو پیش کر کے معاملہ ختم کر دیا لیکن یہ سوال باقی رہا کہ آیا "خضر راہ" کے اشعار واقعی بے لطف ہیں یا ان کی بیان کردہ بے لطفی کو محض خضر کی حقایق گوئی قرار دے کر ختم کیا جا سکتا ہے؟ معاملے کے اس پہلو پر بحث کے لیے قریشی صاحب نے مولانا مہر سے کہا، جس پر یہ تحریر مرتب ہوئی۔

معاملے کا صرف ایک پہلو

حضرت علامہ مرحوم و مغفور نے بیان کردہ اعتراض کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا، اسے اصل معاملے کا صرف ایک پہلو سمجھنا چاہیے اور اجمال یا کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے مرحوم نے اسی پر اکتفا فرمایا لیکن "خضر راہ" کے بعد حضرت کے بیشتر اردو اشعار اسی وضع و اسلوب کے رہے جو بہ ظاہر اعتراض کا موجب بنا تھا۔ پھر کیا ان کے سلسلے میں محض اتنا ہی جواب اطمینان بخش سمجھا جا سکتا ہے؟ نیز کیا "خضر راہ" سے رفع اعتراض کے لیے محض اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ اس کے بیشتر اشعار خضر کی زبان سے ہیں لہٰذا ان میں تخیل کی رنگینی کے بجائے تجربے، حکمت اور ادائے فریضۂ رہنمائی کا لحاظ ضروری تھا ورنہ وہ عرفی اور نظیری کا کلام بن جاتے؟ جس کی نظر حقیقی شعریت پر ہو یا جو اقبال کے مقام شعر گوئی سے کچھ بھی آگاہی رکھتا ہو وہ ایسے خیال کو ایک لمحے کے لیے بھی دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔

حقیقی شاعر کا مقصد

حقیقی شاعر کا مقصد اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے کہ قوم ہی کو نہیں عالم انسانیت کو صحیح راستے کی دعوت دے، غلط روی سے روکے، انحراف سے باز رکھے، ٹھوکروں سے بچائے، دوسروں کے گمراہ کن طور طریقوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ کر دے، اس کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ محض

تخیل کی رنگینیوں سے دلربا تصویروں کی صفیں آراستہ کرتا جائے، جو ہر آیندو روند کی نظریں بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیں، لیکن نہ کسی کے دل میں عزم و ہمت کے چراغ روشن کر سکیں۔ نہ کسی کے فہم و بصیرت کو جلا دے سکیں۔ نہ خواب کے ماتوں کو جگا سکیں۔ نہ احساسِ زیاں سے بہرہ مندی بخش سکیں اور نہ کسی کو مطلوب منزل پر پہنچا سکیں۔ اقبالؔ کے نزدیک شاعری کا تصوّر ہی یہ نہیں۔ اس نے جب فرمایا تھا:

کہ گئے ہیں شاعری جزو لیست از پیغمبری

تو یہی حقیقت واضح کی تھی کہ شاعر بھی اگر حقیقۃً شاعر ہو تو اپنے دائرے میں قوم اور انسانیت کے لیے رہنمائی کا فرض انجام دے سکتا ہے۔ وہ پیغمبر نہیں ہوتا۔ پیغمبری خدا کی رحمت کا ایک روشن نشان ہے تاہم وُہ جزوًا دعوتِ حق کا فرض ضرور پُورا کرتا ہے۔

قربِ منزل اور اندازِ دعوت

یقیناً "خضرِ راہ" کا اسلوب و انداز اقبالؔ کی سابقہ نظموں سے مختلف تھا، لیکن یہ فکر و نظر کی رفعت و برتری کا کرشمہ تھا۔ اقبالؒ کی دعوت میں زیادہ پختگی اور استقامت پیدا ہو گئی تھی جس منزلِ مقصود کو وُہ پہلے صرف فکر و خیال میں دیکھ رہے تھے وُہ پہلی عالمی جنگ کے بعد زیادہ محسوس و مشہود شکل میں سامنے آ گئی تھی۔ ایک موقع پر اقبالؒ نے کہا تھا:

صفتِ شمعِ لحد مردہ ہے محفل میری
آہ! اے رات بڑی دور ہے منزل میری

یہ افسردگی و پژمردگی نہیں بلکہ پیشِ نظر کام کی دشواری اور سنگینی کا احساس تھا۔ "خضرِ راہ" کے وقت منزل مختلف پہلو قدرت نے اس طرح روشن کر دیے تھے جس طرح سینما کے پردے پر کہانیاں آجاتی ہیں۔ اگرچہ یہ کیفیت بھی ہر آنکھ نہیں صرف اقبالؒ کی آنکھ دیکھ رہی تھی، لہٰذا نظم کے طرز و رنگ میں "تبدیلی آ گئی۔ تاہم آپ سوچیں، غور کریں، ڈھونڈیں کہ آیا اس قسم کے بدیع، جامع اور دل پذیر انداز کی مثالیں اس سے پیشتر بھی اُردو یا فارسی کی

شاعری میں ملتی ہیں ؟

اسی وجہ سے اقبالؒ کو حیرت ہوئی تھی کہ ایسا اعتراض گرامی سے منسوب ہوا جو خود بڑا شاعر تھا اگرچہ صرف کلاسیکی انداز کے شعر کہنے میں عمر گزار دی تھی۔

"خضر راہ" پر مفصل بحث کا یہ مقام نہیں لیکن چند ایسی مثالیں ضرور پیش کر دینی چاہئیں، جن سے کلاسیکی (جس کا نمایندہ گرامی تھا) یا عمومی نقطۂ نگاہ کے مطابق یقین ہو جائے کہ واقعی وہ محاسن شعری کا انتہائی نقطۂ اوج و عروج پیش کر رہے ہیں۔

پہلا منظر

شاعری میں منظر کشی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ "خضر راہ" کا موضوع منظر کشی نہ تھا تاہم جہاں کہیں اتفاقیہ موقع آگیا ہے وہاں اس کمال کی کرشمہ فرمائیاں بھی دیدنی ہیں۔ مثلاً ابتدا میں رات کے وقت ساحل دریا کی کیفیت ملاحظہ ہو:

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب!
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو، گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

دیکھیے تین شعروں میں صرف چند چیزیں پیش کیں، لیکن زمین سے آسمان تک پورے ماحول کی مکمل تصویر لفظوں میں اتار دی۔ پھر منظر کی مناسبت سے الفاظ چُنے۔ گہوارے میں طفل شیرِ خوار کی نیند گہری ہوتی ہے وہی کیفیت موجِ مضطر کے خواب کی ہے۔ رات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ روشنی مدھم ہو جائے چنانچہ چاند کے نکل آنے سے ستاروں کے چراغوں کی لو بھی دھیمی ہو گئی۔

دوسرا منظر

دوسرا منظر ملاحظہ فرمایئے جس کا تعلق صحرائی زندگی سے ہے۔ فرماتے ہیں:

اے رہین خانہ! تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اختر سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبینِ جبرئیل[۳]
وہ سکوتِ شام صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

اُردو ہی نہیں، کسی بھی زبان میں منظر کشی کے ایسے ٹکڑے تلاش کر دیکھیے، نہیں ملیں گے۔ پانچ شعروں میں جو کچھ پیش کر دیا ہے اس کی تفصیل کے لیے دفتر تیار کرا لیجیے لیکن یہ دل آویزی، یہ نفوذ و تاثیر ہرگز پیدا نہ ہو گی اور شاعر کا جو مقصد ہے (اس لیے کہ وہ کوئی بھی بات بے مقصد کہنے کا عادی نہیں) وہ صرف یہی شعر پورا کر سکتے ہیں۔ تشبیہات سب کی سب نئی ہیں اور ہر تشبیہ اپنی جگہ ایک خاص دعوت کی حامل ہے۔

تڑپا دینے والے اشعار

پھر دیکھیے اس مختصر سی نظم میں دل کو تڑپا دینے والے اشعار کی بھی کمی نہیں مثلاً:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ[۴]
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے ، نمرود ہے !
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے ؟

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشت بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

فکر و بیاں کے معجزے ایسے شعر بھی خاصی تعداد میں ہیں جنھیں فکر و نظر ، دل آویزیِ اسلوب اور کمالِ حسنِ بیان کے معجزے قرار دینے میں بھی کسی کو تامل نہ ہوگا مثلاً :

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی "جاں" اور کبھی "تسلیم جاں" ہے زندگی

یہ شعر، خصوصاً دوسرا مصرع اختصارِ الفاظ اور وسعت و بے کرانیِ معانی کے اعتبار سے بے شائبہ ریب بے مثال ہے۔ انسان نے روے ارض پر ظہورِ آدمؑ کے وقت سے اب تک ایثار و عزیمت کی جتنی داستانیں اپنے خونِ حیات سے مزین کیں یا آیندہ مزین کرے گا ان سب کا نچوڑ صرف نو لفظوں میں پیش کر دیا ہے اور حقیقت کے اعتبار سے صرف تین لفظوں میں : "جاں" اور "تسلیم جاں"۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں ، پیہم دواں ، ہر دم جواں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹھی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو؟
آہ! اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو!

پیغامِ اقبالؒ

سب سے آخر میں "خضرِ راہ" سراپا اقبالؒ کے پیغام کی آئینہ دار ہے مثلاً :

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچۂ ساں، غافل! ترے دامن میں شبنم کب تلک؟
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اِک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پہ مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہ گزر

یورپی استعمار کا انجام

"شمع اور شاعر" ۱۹۱۲ء میں سنائی گئی تھی اس میں "جلوۂ تقدیر" دکھاتے ہوئے فرمایا تھا:

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

ممکن ہے ۱۹۱۲ء میں یہ خیال اکثر لوگوں کو نیا معلوم ہوا ہو، لیکن اقبالؒ کے نزدیک نیا نہ تھا وہ تو مارچ ۱۹۰۷ء میں اہل یورپ کو سنا چکے تھے:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپایدار ہو گا

۱۹۱۲ء میں یورپ کا استعمار کمال اوج پہ پہنچا ہوا تھا اور بہ ظاہر اس آہنی گرفت کو توڑنے والی کوئی قوت موجود نہ تھی لیکن تہذیب فرنگ کی خودکشی کے بارے میں پیشگوئی کرنے والے اقبالؒ کو یقین تھا کہ اس دریا کی سطوتِ رفتار سے مرعوب و ہراساں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ خود اس کی موجیں ہی اسے زنجیر بن کر جکڑ لیں گی گویا تباہی کے سامان اس کے اندر ہی سے پیدا ہوں گے۔

خودکشی کے ڈرامے کا پہلا ایکٹ

عالمی جنگ میں خودکشی کے ڈرامے کا پہلا ایکٹ دنیا کے سامنے آچکا تھا

اگرچہ اس وقت تک عالم اسلام کے احوال وظروف نظر بہ ظاہر سازگار نہ تھے لیکن اقبالؒ کے نزدیک منزل قریب نظر آگئی تھی۔ دیکھیے وہ کس یقین و وثوق سے کہتے ہیں:

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں! آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں میرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دُھندلی سی اک تصویر دیکھ

نئی پیش گوئی | محض یہی نہیں یہ بھی کہہ دیا:

آزمودہ فتنہ ہے اِک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

۱۹۲۲ء میں کسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ "آزمودہ فتنہ" کون سا ہے؟ بلکہ سالہا سال بعد تک بھی کچھ اندازہ نہ ہو سکا، تاہم اقبالؒ جانتے تھے کہ اتحادیوں نے جنگ میں کامیابی کے بعد صلح کا جو نقشہ تیار کیا ہے اس میں دوسری عالمی جنگ کے اسباب بوجہ اتم فراہم کر دیے ہیں وہ ضرور بروے کار آئیں گے۔ دوسری جنگ ضرور ہو گی۔ یہ "آزمودہ فتنہ" بجلی بن کر یورپ کے خرمنِ استعمار پر گرے گا اور اسے خاکستر بنا کر رکھ دے گا۔ دانایانِ فرنگ کی کوئی "تدبیر"، کوئی مصلحت اندیشی، کوئی حکمت عملی، کوئی صوابدید، کوئی ساز باز "تقدیر" کے اس سیلِ بے زنہار کو روک نہ سکے گی۔ آخر ۱۹۳۹ء میں یہی ہوا۔ موجِ مضطر ہی سطوتِ رفتارِ دریا کے لیے زنجیر پا بن گئی۔ اسلام نے حریت عامہ کا جو خواب دیکھا تھا

وہ ایک حقیقت ثابتہ بن کر آج سب کے سامنے آچکا ہے۔ یورپی استعمار ہی نہیں، ہر استعمار ماضی کی ایک عبرت ناک داستان رہ گیا ہے۔

حقیقتِ حال

اس نظم کے لیے کون وُہ الفاظ دہرانے کی جسارت کرے گا جو خان نیاز الدین خاں نے مولانا گرامی کی طرف سے پیش کیے تھے؛ حضرت علامہ نے بجا فرمایا تھا کہ یہ اعتراض گرامی کا نہیں ہوسکتا، خان صاحب کو اعتراض کے سمجھنے میں غلطی لگی۔ "خضرِ راہ" یقیناً ایک بے مثال نظم تھی۔ اس میں اقبالؒ کی شاعری نئی اوج گاہوں پر پہنچ گئی تھی۔ آج بھی یہ نہایت قابل قدر نظم ہے اور اس کے اکثر اشعار کی مثال کلامِ اقبالؒ کے سوا اُردو یا کسی دوسری زبان کی قومی شاعری میں نہیں مل سکتی اور مقامِ دعوت تو پہلے ہی یگانہ تھا، آج بھی یگانہ ہے۔

(صہ ۲۰۷ مکاتیب اقبال بنام گرامی)

اسرارِ خودی

اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ خود اقبالؔ نے منشی سراج الدین کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا:

"یہ مثنوی (اسرارِ خودی) گزشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی، مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند انوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس پروفیشن (بیرسٹری) میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے، کام بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہوتا، جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے۔ گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے، جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔[1]"

یہ مکتوب ۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مثنوی کا آغاز ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ فکر و تصور میں بھی آغاز کا وقت یہی درست تسلیم کر لینا چاہیے یا سلسلہ بہت پیچھے جاتا ہے؟

اکرام الحق صاحب سلیم کا بیان

اکرام الحق صاحب سلیم بی۔اے فرماتے ہیں:

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول (ص ۲۳-۲۴)

اقبال ابھی کیمبرج ہی میں تھے اور کسی انگریزی رسالے کے لیے اسلامی سیاست پر مضمون لکھ رہے تھے کہ یکایک ان کے دل میں سوال پیدا ہوا، مسلمانوں کے زوال کا نفسیاتی محرک کیا تھا؟ اس کے جواب کے لیے سارا ذخیرہ دیکھ گئے، جو ان کے نزدیک، کسی نہ کسی پہلو سے قابلِ اعتنا تھا تاہم انھیں شافی جواب نہ مل سکا اسی وقت سے وہ وجوہ تنزل پر غور کرتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی قوتِ عمل شل ہو چکی ہے۔ ان میں اسلاف کا سا ولولہ، جوش، خلوص اور ایثار باقی نہیں رہا۔ وہ توحید کی روح سے خالی ہو چکے ہیں خوفِ خدا کی جگہ ان چیزوں نے لے لی ہے، جنھیں اسلام سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے حقیقی اسلامیت کی بیداری کے لیے ایک نظام فکر ترتیب دیا، جس کے پہلے حصے نے "اسرارِ خودی" کی شکل اختیار کی۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں ابتدائی دور کی عملی روح اور خدا کے سوا ہر شے سے بے پروائی پیدا نہ ہوگی، وہ کوئی کام انجام نہ دے سکیں گے۔ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ادبیات کے ذخیرے میں ایسی کتابیں ناپید ہیں، جو مسلمانوں میں "خودی" اور جد و جہد کی روح پھونک سکیں۔ جتنی کتابیں ان میں رائج تھیں، خودی، خودداری، ہمت، جوش اور ایثار کی تضعیف کا باعث تھیں۔

محترمہ عطیہ فیضی کے نام مکتوب

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس مقصد و نصب العین نے شاعر کی کارگاہِ افکار میں کیا کیا شکلیں اختیار کیں یہاں تک کہ یہ "اسرارِ خودی" کے سانچے میں ڈھل کر منظرِ عام پر نمودار ہوا۔ اقبال کی اپنی تحریرات کا مطالعہ بہ دقت نظر کیا جائے تو کہیں کہیں ایسے نقوش مل جاتے ہیں جن کی رہنمائی میں ہم "اسرار و رموز" کے مختلف ارتقائی مراحل کا سراغ لگا سکتے ہیں مثلاً میرے علم کے مطابق ایک فارسی مثنوی کا ابتدائی ذکر اقبال نے ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء کے ایک مکتوب میں، جو محترمہ عطیہ فیضی کے نام تھا، کیا تھا۔ بہ ظاہر یہ کسی ایسی ہی مثنوی کا ذکر تھا، جیسی بعد میں "اسرارِ خودی" کے

نام سے منظرِ عام پر آئی۔ فرماتے ہیں:

"قبلہ والد صاحب نے فرمایش کی کہ حضرت بوعلی قلندرؒ کی مثنوی کے طرز پر ایک فارسی مثنوی لکھوں اس راہ کی مشکلات کے باوجود میں نے کام شروع کر دیا ہے۔ تمہیدی بند ملاحظہ فرمائیے:

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن — بزم را از ہا و ہو آباد کن
آتش استی بزمِ عالم بر فروز — دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز — اشکِ خونیں را جگر پرکالہ ساز
پشتِ پا بر منزلِ دنیا بزن — موجہ ای بیرون ایں دریا بزن

شیخ بوعلی قلندر کی مثنوی

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ اقبال نے ۱۹۱۱ء میں والد ماجد کی فرمایش پر ایک مثنوی شیخ بوعلی قلندرؒ کی مثنوی کے انداز پر لکھنی شروع کر دی تھی۔ شیخ موصوف کے مطبوعہ کلام سے واضح ہوتا ہے کہ دیوان اور متفرقات کے علاوہ ان سے تین مثنویاں منسوب ہیں۔ ایک خاصی طویل ہے، اس کا نام "مخزن معنوی" بتایا گیا ہے۔ دوسری پہلی سے ذرا مختصر ہے اس کا نام "کلام قلندری" ہے۔ تیسری مثنوی سب سے چھوٹی ہے اور اس کا کوئی خاص نام نہیں۔ مطبوعہ کلام میں اسے "مثنوی بوعلی قلندر" قرار دیا گیا ہے۔ یہی مشہور و متداول تھی اور الگ طبع ہو کر بھی فروخت ہوتی رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال اور ان کے والدِ ماجد کے پیشِ نظر یہی آخری مثنوی تھی۔ "اس کے طرز" سے مقصود غالباً صرف بحر تھی، باقی ظاہر ہے کہ شیخ کی مثنوی کے جو مطالب تھے وہ اقبال کی مثنوی کے مطالب نہیں ہو سکتے تھے۔ اقبالؒ نے خود بھی شیخ بوعلی قلندرؒ کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اس مثنوی کا پہلا شعر خفیف سی ترمیم کے بعد شامل کر لیا ہے[1] اور ایک شعر "رموز" میں بھی ہے[2]۔

---

[1] شیخ بوعلیؒ کی مثنوی کا شعر ہے:

(باقی اگلے صفحہ پر)

پھر کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اقبالؔ ابتدا میں ایک مختصر سی فارسی مثنوی لکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے شیخ بوعلی قلندرؒ کی مثنوی کا حوالہ دیا، جو مختصر تھی، یا ممکن ہے کہ اقبالؔ نے والد ماجد سے مجوزہ مثنوی کا ذکر کیا ہو اور انھوں نے مشورہ دیا ہو کہ شیخ بوعلی قلندرؒ کی مثنوی کا انداز پیش نظر رکھو۔ اس کے لیے قرائن موجود ہیں، البتہ ظاہر ہے کہ یقین و وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مولانا رومؒ

یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا میں مختصر مثنوی لکھنے کا خیال ہو پھر اس موضوع پر غور و فکر کا سلسلہ جاری رہا تو زیادہ مطالب سامنے آ گئے اور مثنوی کو پھیلانا پڑا، یہاں تک کہ اس کے تین حصے لکھنا چاہتے تھے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا، مگر صرف دو حصے لکھ سکے۔ اس وقت مولانا رومؒ پیش نظر آئے اور ان کی مثنوی سے انتساب مناسب سمجھا گیا۔ نیز مولانا رومؒ مختلف صورتوں میں ان کی ذہنی اور روحانی رہبری فرماتے رہے جو چار شعر محترمہ عطیہ فیضی کے مکتوب میں منقول ہیں ان میں سے تین (دو تھوڑی سی ترمیم کے بعد) اسرار خودی کے اس حصے میں شامل ہیں جس میں مولانا رومؒ نے بہ عالم خواب مثنوی لکھنے کی ہدایت فرمائی۔[10]

بہر حال اگر اکرام الحق صاحب سلیم کا بیان درست ہے کہ اقبالؔ دورانِ قیام کیمبرج ہی میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷)

مرحبا اے بلبل باغِ کہن   از گل رعنا بگو با ما سخن

اقبالؔ نے یہ شعر یوں بنا دیا:

آں نوا پیرائے گلزارِ کہن   گفت با ما از گلِ رعنا سخن   (اسرار و رموز صفحہ ۲۷)

[9] پشت پا زن تخت کیکاؤس را   سر بدہ از کف مدہ ناموس را   (اسرار و رموز صفحہ ۱۰۴)

[10] اسرار و رموز (صفحہ ۹)

کوئی ایسی چیز لکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے جو مسلمانوں میں حقیقی بیداری پیدا کر سکے تو قیاس یہی ہے کہ اس چیز نے ذہن میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ ابتدا میں اس کی حیثیت کچھ تھی، پھر نئے نئے پہلو سامنے آتے رہے، یہاں تک کہ دو مثنویوں کا خاکہ ان کے ذہن میں مکمل ہو گیا۔ ایک کا تعلق حیات فرد سے تھا، اس کا نام "اسرار خودی" رکھا، دوسری کا تعلق حیات ملت سے تھا اور ملت افراد کے اجتماع سے ترکیب پاتی ہے یعنی افراد مشترک مقاصد و مصالح کی غرض سے انفرادی ہستیوں پہ پابندیاں لگا لیتے ہیں لہٰذا اسے "رموزِ بیخودی" سے موسوم کیا گیا۔ باقی رہا اقبال کا یہ ارشاد کہ "اسرار خودی" گزشتہ دو سال میں لکھی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مثنوی کا خاکہ مکمل کر لینے کے بعد دو سال کے اندر اس میں رنگ بھرا گیا۔ یہ مطلب نہیں کہ اس سے پیشتر مثنوی کی کوئی الگ صورت ذہن میں نہیں آئی تھی یا وہ دوسرے خطوط پر غور و فکر نہیں کرتے رہے تھے۔

مثنوی کا نام مثنوی کے نام کا مسئلہ اس کی تکمیل کے بعد بھی اقبال کے نزدیک زیرِ غور رہا۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی نام کے بارے میں مشورے فرماتے رہے۔ چنانچہ ۶۔ فروری ۱۹۱۵ء کے ایک مکتوب میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے اب قریباً تیار ہے اور پریس میں جانے کو ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی عمدہ نام تجویز فرمائیے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام "اسرار حیات"، "پیام سروش"، "پیامِ نو"، "آئین نو" تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ میں انتخاب کر سکوں۔"[1]

مثنوی کی ابتدائی جھلک "اسرارِ خودی" کی اشاعت سے چھ سات مہینے پیشتر انجمن

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم (ص ۳۶۸)

حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہوا تھا جس میں اقبال نے "عجمی تصوف اور اسلام" پر لکچر دیا تھا۔ اس میں انھوں نے فرمایا تھا:

"اس مروجہ تصوف کو اسلام کے سادہ قواعد اور عربی روح دین سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کا بنیادی ستم یہ ہے کہ یہ "خودی" کو تباہ کرتا ہے، حالانکہ "خودی" ہی ایک ایسی چیز ہے جو افراد و اقوام کی زندگی کی ضامن اور انسان کو بلند ترین مادی و روحانی مدارج پر پہنچانے کی کفیل ہے۔"

مزید آگے بڑھ کر فرمایا:

"تصوف کے لٹریچر میں جہاں کہیں "خودی" کو مارنے کا ذکر آیا ہے، وہاں عوام اس کے معنی غرور و تکبر کرتے ہیں جو حقیقۃً رذائل میں سے ہے اور اس سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے، لیکن متصوفین نے یہ لفظ غرور کے معنی میں استعمال نہیں کیا، بلکہ "احساسِ ذات"، "انا" اور "میں" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مٹا دے، اپنے نفس کی نفی کر دے، تب معرفت کی منزل پر فائز ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ تصور بالکل خلاف اسلام ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی نہ صرف قایم رہے بلکہ ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جو اس کے لیے مقدر ہے اور جس سے بڑا کوئی مقام انسانی تصور میں نہیں آ سکتا۔"[1]

اس کے بعد فرمایا کہ میں نے "اسرار خودی" کے نام سے ایک مثنوی مرتب کی ہے جس میں "خودی" کے متعلق حقائق واضح کیے ہیں۔ یہ مثنوی عنقریب شائع ہوگی اور اس سے

---

[1] رسالہ "اقبال" بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء (ص ۶۵)

عجمی تصوف کا وہ طلسم پاش پاش ہو جائے گا جس نے مسلمانوں کو توفیق عمل سے محروم کر کے جامد و منجمد بنا رکھا ہے پھر مثنوی کے کچھ اشعار سنائے۔ یہ اس کتاب کی پہلی جھلک تھی جو آگے چل کر اقبال کی مستقل تعلیمات میں بنیادی حیثیت اختیار کرنے والی تھی۔

مثنوی کے کچھ اشعار اشاعت سے پیشتر خواجہ حسن نظامی کے اخبار "توحید" میں بھی شائع ہوئے تھے اور خواجہ صاحب نے اشعار کی تعریف کرتے ہوئے انھیں ازبر کر لینے کی سفارش کی تھی بعد میں بحثیں چھڑیں تو خواجہ صاحب نے خود بھی ایک تحریر میں اس واقعے کا اعتراف کیا تھا۔[1]

مثنوی کے خلاف ہنگامہ

غرض مثنوی شائع ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ تھا، جو بارہ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ فی صفحہ تقریباً ایک سو چالیس لفظ تھے۔ ایک پیشکش تھی جس میں مثنوی کو سرِ امام علی سے منسوب کیا گیا تھا۔ جو اس زمانے میں وہ دولت آصفیہ کے "باب حکومت" کے صدر تھے، یعنی انھیں صدر اعظم کا منصب حاصل تھا، لیکن انتساب کی وجہ ان کا منصب نہ تھا بلکہ ان کے اور اقبال کے گہرے ذاتی مراسم تھے باقی مثنوی کی عام حیثیت وہی تھی، جو اب ہے۔ البتہ پہلے ایڈیشن میں خواجہ حافظ کے متعلق ایسے اشعار لکھے گئے تھے، جو مختلف لوگوں خصوصاً ارباب تصوف کو بہت ناخوشگوار محسوس ہوئے حالانکہ اقبال کا مقصودِ انتقاد خواجہ حافظ یا ان کی شاعری نہ تھے، بلکہ وہ بہتر اور صالح ادبیات بروے کار لانے کے داعی تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ اشعار حذف کر دیے گئے اور ان کی جگہ اصلاح ادبیات اسلامیہ اور حقیقت شعر کے زیرِ عنوان اشعار شامل کر دیے گئے۔

اس مثنوی کے خلاف بعض حلقوں میں شور بپا ہوا، جس کے اسباب ذیل ہیں

---

[1] رسالہ "اقبال" بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء (ص ۵، ۶)

درج ہیں :

۱۔ سمجھا گیا کہ اقبالؔ تصوف کے مخالف ہیں، حالانکہ اس کے لیے کوئی قابل ذکر وجہ یا بناء موجود نہ تھی۔

۲۔ اقبالؔ نے خواجہ حافظ کی بے حرمتی کی ہے۔

۳۔ اقبالؔ نے وحدت الوجود کو غلط بتایا ہے۔

۴۔ اقبالؔ نے مثنوی سر امام علی سے منسوب کر کے اپنی خودی پر ضرب لگائی ہے۔

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، زیادہ تر لوگ خواجہ حافظ ہی کے معاملے سے متاثر ہوئے خواجہ صاحب کو بالعموم شاعر نہیں، ولی سمجھا جاتا تھا اور ان کی شراب شرابِ معرفت مانی جاتی تھی اگرچہ اس تعبیر کے لیے کوئی گنجایش موجود نہ تھی تاہم میں یہاں کوئی بحث نہ چھیڑوں گا۔ میری خواہش یہ ہے کہ سب سے پہلے مثنوی کے تمام ضروری متعلقات خوانندگان کرام کے سامنے پیش کر دوں پھر وہ سب کچھ مرتب صورت میں سامنے لاؤں جو اقبالؔ نے اپنے افکار کی توضیح یا غلط انتسابات کی تردید یا بعض امور کے اعتراف میں کہا ہے بعد ازاں ضرورت محسوس ہوئی تو بعض باتوں کی مزید توضیح کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ اپنے موقف کے دفاع کے لیے اقبالؔ بہترین اور موزوں شخص ہو سکتے تھے۔ کوئی دوسرا شخص نہ ان سے بڑھ کر زیرِ غور مسائل کا اندازہ داں تھا، نہ ان مسائل کی تائید میں اقبالؔ سے قوی تر دلائل پیش کر سکتا تھا۔ کیوں نہ سب سے پہلے انھی کے منتشر اور بکھرے ہوئے ارشادات کو یکجا کیا جائے ؟ البتہ ممکن ہے، کوئی ضروری پہلو اتفاقیہ نظر انداز ہو گیا ہو تو اس کے متعلق حسبِ ضرورت توضیحات پیش کی جا سکتی ہیں۔

دیباچہ سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دیباچے کے اہم نکات خود اقبالؔ کے الفاظ میں پیش کر دیے جائیں، جسے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق حذف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے

جتنی توضیح فرمائی تھی وہ اصل مطلب کے لیے کافی نہ تھی۔ جتنی توضیح ضروری تھی وہ ایسی تفصیل کی محتاج تھی کہ دیباچہ بجائے خود ایک کتاب بن جاتا۔ لہٰذا انھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے حذف کر دیں۔ ہاں کوئی شخص ان کے موقف پر شرح وبسط سے لکھنا چاہے تو وہ دیباچہ اس سفر میں سنگہائے میل کا کام دے سکتا ہے۔ انھوں نے خود حافظ اسلم جے راج پوری مرحوم کو لکھا کہ دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا، جیسا کہ بعض اصحاب کے خطوط سے اور دیگر تحریروں سے معلوم ہوا جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ لہٰذا میں نے اسے حذف کر دیا۔[1]

اہم نکات | دیباچے کا خلاصہ اقبال ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

۱۔ یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پُر اسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے، مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہو گی، جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس کے جواب کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔

---

[1] "اقبال نامہ" حصہ اوّل (ص ۵۳)

۲۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا، جس قدر ان کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی "انا" محض ایک فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق انھیں ایسے نتائج کی طرف لے گیا، جن کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی۔

۳۔ ہندو قوم کے موشگاف حکماؔ نے قوتِ عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "انا" کی حیات کا یہ مشہور تسلسل، جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے، عمل سے متعین ہوتا ہے گویا انسانی "انا" کے موجودہ کیفیات و لوازم اسی کے گزشتہ طریقِ عمل کا لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ "قانونِ عمل" اپنا کام کرتا رہے گا، وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔

۴۔ اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکماؔ نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت یا بہ الفاظ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا۔ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیے سے پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ کہ جب "انا" کی تعیین عمل سے ہے تو "انا" کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترکِ عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملّی پہلو سے نہایت خطرناک تھا۔

۵۔ سری کرشن نے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کُلّی نہیں کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے۔ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ ہو۔

۶۔ افسوس کہ جس عروس معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔ سری شنکر (شنکراچاریہ) کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔

۷۔ مسئلہ "انا" کی تحقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ کی یہ مماثلت نہایت عجیب وغریب ہے کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدت الوجود کو اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے۔ رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگے گئے۔

۸۔ ہندو حکما نے وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو مخاطب کیا۔ ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا، یعنی انھوں نے دل کو آماجگاہ بنایا اور اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔

۹۔ علمائے قوم میں سب سے زیادہ غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمہ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر اعلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی مگر افسوس کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا، مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

۱۰۔ مغربی اقوام اپنی قوت عمل کی وجہ سے تمام اقوام عالم میں ممتاز ہیں اور اسی وجہ سے اسرار زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کے ادبیات وتخیلات اہل مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں۔

۱۱۔ مغرب کے فلسفہ جدید کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی (سپینوزا) کے نظام

وحدت الوجود سے ہوتی ہے لیکن مغرب کے طبائع پر رنگ عمل غالب تھا۔ وحدت الوجود کا طلسم، جسے ریاضیات کے طریق استدلال سے پختہ کیا گیا تھا، دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔

۱۲۔ سب سے پہلے جرمنی میں انسانی "انا" کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفہ مغرب، بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت، اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے۔

۱۳۔ جس طرح رنگ و بو کے لیے مختص حواس ہیں، اسی طرح انسانوں میں ایک اور حاسہ بھی ہے جسے "حس واقعات" کہنا چاہیے۔ ہماری زندگی واقعات گرد و پیش کے مشاہدہ کرنے اور ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس قوت سے کام لیتے ہیں جسے اصطلاحاً "حس واقعات" سے تعبیر کیا گیا ہے؟

۱۴۔ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں "حس واقعات" اور اقوام کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی "دماغ یافتہ" فلسفیانہ نظام، جو واقعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو، انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں۔

۱۵۔ یہ ہے اس مسئلے کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ، جو اس نظم کا موضوع ہے۔ اس سے نظم کی تفسیر مقصود نہیں، محض ان لوگوں کو نشان راہ بتانا مقصود ہے، جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت کی دقتوں سے آشنا نہیں۔

۱۶۔ رہا شاعرانہ پہلو تو شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ

دلانے کا کہ لذتِ حیاتِ انا کی انفرادی حیثیت ، اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔

۱۷۔ لفظ خودی اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام اردو میں مستعمل ہے اور اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعیین ذات ہے۔

اب میں مختلف امور کے متعلق خود اقبال کی تحریرات پیش کروں گا تاکہ ان کا نقطۂ نگاہ واضح صورت میں سامنے آجائے اور یہی اس مقدمے کی حقیقی غرض و غایت ہے۔

توحید اور وحدت الوجود کا فرق

اقبال نے "اسرار خودی" کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ ایرانی شعرا نے وحدۃ الوجود کی تفسیر میں دل کو آماجگاہ بنایا اور اس مسئلے میں ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیاں عوام تک پہنچیں تو تمام مسلمان قومیں ذوقِ عمل سے محروم ہوگئیں۔ اسی مسئلے کے متعلق اقبال کی مختلف تصریحات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے وہ توحید اور وحدۃ الوجود کا فرق واضح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"صوفیا کو توحید اور وحدۃ الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مرادف نہیں، بلکہ مقدم الذکر کا مفہوم خالص مذہبی ہے اور موخر الذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کے مقابلے میں یا اس کی ضد لفظ "کثرت" نہیں، جیسا کہ صوفیا نے تصور کیا ہے، بلکہ اس کی ضد "شرک" ہے۔ وحدۃ الوجود کی ضد "کثرت" ہے۔"

"اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدۃ الوجود یا زمانۂ حال کے فلسفۂ یورپ کی اصطلاح میں توحید کو ثابت کیا، وہ موحد تصور کیے گئے، حالانکہ ان کے ثابت کردہ مسئلے کا تعلق مذہب سے نہ تھا، بلکہ نظام عالم کی حقیقت سے تھا۔"

"اسلام کی تعلیم نہایت صاف و روشن ہے، یعنی عبادت کے قابل صرف ایک ذات ہے، باقی جو کچھ کثرت نظام عالم میں نظر آتی ہے، وہ سب کی سب مخلوق ہے، گو علمی اور فلسفیانہ اعتبار سے اس کی کنہہ اور حقیقت ایک ہی ہو چونکہ صوفیا نے فلسفے اور مذہب کے دو مختلف مسئلوں یعنی توحید اور وحدۃ الوجود کو ایک ہی مسئلہ سمجھ لیا، اس واسطے ان کو یہ فکر ہوئی کہ توحید ثابت کرنے کا کوئی اور طریق ہونا چاہیے، جو عقل و ادراک کے قوانین سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس غرض کے لیے حالت سکر ممد و معاون ہوئی۔ یہ اصل ہے مسئلہ حال و مقامات کی۔ مجھے حالتِ سکر کی واقعیت سے انکار نہیں، صرف اس بات سے انکار ہے کہ جس غرض کے لیے یہ حالت پیدا کی جاتی ہے وہ غرض اس سے مطلق پوری نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ صاحبِ حال کو ایک علمی مسئلے کی تصدیق ہو جاتی ہے، نہ کہ مذہبی مسئلے کی۔"[1]

وحدۃ الوجود پر انتقاد

اس طرح توحید اور وحدۃ الوجود کے درمیان واضح امتیاز پیدا کر کے صوفیہ کی حالت سُکر کی حقیقت بھی کھول کر بیان کر دی پھر یہ سوال سامنے آیا کہ وحدۃ الوجود ہے کیا؟ فرماتے ہیں:

"صوفیہ نے وحدت الوجود کی کیفیت کو محض ایک مقام لکھا ہے، لیکن یہ سوال کسی دل میں پیدا نہ ہوا کہ آیا یہ مقام کسی حقیقت نفس الامری کو واضح کرتا ہے؟ اگر کثرت حقیقت نفس الامری ہے تو یہ کیفیت وحدت الوجود، جو صاحبِ حال پر وارد ہوتی ہے، محض دھوکا ہے اور مذہبی اور فلسفیانہ اعتبار سے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اگر کیفیت وحدۃ الوجود محض ایک مقام ہے اور کسی

---

[1] رسالہ "اقبال" بابت اپریل ۱۹۵۴ء (ص ۴۶-۴۷)

حقیقت نفس الامری کا انکشاف اس سے نہیں ہوتا تو پھر اسے معقول طور سے ثابت کرنا فضول ہے، جیسا کہ محی الدین ابن عربی اور دیگر صوفیہ نے کیا ہے۔ نہ اس کے محض مقام ہونے سے روحانی زندگی کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ قرآن کی تعلیم کے رو سے وجود فی الخارج کو ذاتِ باری سے نسبت اتحاد کی نہیں بلکہ مخلوقیت کی ہے۔ اگر قرآن کریم کی تعلیم یہ ہوتی کہ ذات باری کثرت فی نظام عالم میں دائر و سائر ہے تو کیفیت وحدۃ الوجود کو قلب پر وارد کر سکنا مذہبی زندگی کے لیے نہایت مفید ہوتا، بلکہ مذہبی زندگی کی آخری منزل ہوتی۔"[1]

اعترافِ حقیقت

بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ ایک زمانے میں اقبال خود ان عقائد کے قائل تھے فرماتے ہیں:

"مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقاید و مسائل کا قائل رہا، جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قِدم ارواح کملاء، مسئلہ وحدۃ الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ یا دیگر مسائل جن میں بعض کا ذکر عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب "انسان کامل" میں کیا ہے۔ یہ تینوں مسائل میرے نزدیک مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے..... مسئلہ قدمِ ارواح افلاطونی ہے۔ بوعلی سینا اور ابونصر فارابی دونوں اس کے قائل تھے، چنانچہ امام غزالی نے اسی وجہ سے دونوں بزرگوں کی تکفیر کی ہے۔ شیخ ابن عربی نے اس مسئلے میں اس

---

[1] رسالہ اقبال بابت اپریل ۱۹۵۴ء (ص ۴۷)

قدر ترمیم کی کہ صلحا و کملا کے ارواح کے قدم کے قائل ہوئے مگر ظاہر ہے کہ اصول وہی ہے اور مسلمانوں میں اس مسئلے نے قبر پرستی کی بنیاد رکھی۔"[1]

وحدت الوجود اور تنزلات ستّہ

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ تنزلات ستہ کا مسئلہ افلاطونیت جدیدہ کے بانی پلوٹانیس کا تجویز کردہ ہے مسلمانوں کے ابتدائی دور میں افلاطونیت جدیدہ کی ایک کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا گیا تھا اور اس کا نام "الٰہیات ارسطو" رکھ دیا گیا۔ مسلمان اب تک اس کے مضمون کو "فلسفہ ارسطو" تصور کرتے ہیں، حالانکہ اٹلی کے ایک پروفیسر نے قوی دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ اس کتاب کو الٰہیات ارسطو سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ پلوٹانیس کے خیالات کا عربی ترجمہ ہے۔ یوں مسئلہ تنزلات ستہ یونانی فلسفے سے منتقل ہو کر عربی میں آیا۔ اسلامی حکما و صوفیہ نے اپنی اپنی اغراض کے مطابق اسے اصطلاحات اسلامیہ میں بیان کیا:

"شیخ شہاب الدین مقتول نے حکمۃ الاشراق میں اس مسئلے کو یوں بیان کیا ہے کہ اسلام سے پہلے کے زرتشتی فلسفے کو بھی اس میں ملا دیا ہے اور اس زرتشتی عنصر کی تصدیق و توثیق کے لیے قرآن کی مشہور آیت اللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تلاش کی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں بہت سے صوفی حضرات اس مسئلے کے قائل ہیں اور غالباً اس وجہ سے کہ وہ اس کی تاریخ سے آگاہ نہیں۔"

"مسئلہ وحدۃ الوجود گویا مسئلہ تنزلات ستہ کی فلسفیانہ تکمیل ہے بلکہ یوں کہیے کہ عقل انسانی خود بخود تنزلات ستہ سے وحدۃ الوجود تک پہنچی ہے.....
میرا مذہب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نظام عالم میں جاری و ساری نہیں بلکہ

---

[1] رسالہ "اقبال" اکتوبر ۱۹۵۳ء (ص ۲۲-۲۳)

نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے۔ جب وہ چاہے گا، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حکماء کا مذہب تو جو کچھ ہے اس سے بحث نہیں، رونا اس بات کا ہے کہ یہ مسئلہ اسلامی لٹریچر کا ایک غیر منفک عنصر بن گیا ہے اور اس کے ذمہ دار زیادہ تر صوفی شاعر ہیں"۔[1]

اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی لٹریچر تمام و کمال اس زہر سے متاثر ہے، چند مستثنیات ضرور ہیں۔ پنجاب کے ناظرین کو ایک پنجابی شاعر کا قول شاید زیادہ پسند آئے:

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ
شرن پڑے رگناتھ کے سکے نہ تنکا توڑ[2]

مطلب یہ کہ ہم پٹھان کے بیٹے تھے اور ہماری یہ کیفیت تھی کہ فوجوں کے منہ موڑ دیتے تھے، مگر جب سے رگوناتھ جی کے قدم پکڑے ہیں، یعنی جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا جاری و ساری ہے، یہ حالت ہو گئی ہے کہ ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتے کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال دامن گیر رہتا ہے۔

فلسفہ اور تصوف کا اختلاط

ایک مصیبت یہ تھی کہ اہل تصوف نے فلسفے کے مسائل کو تصوف کے مسائل سمجھ لیا تھا بلکہ تصوف کے مسائل میں بھی عموماً فلسفے کی اصطلاحات استعمال کی جاتی تھیں اور اسی وجہ سے عام لوگوں کو مسائل تصوف کی پیچیدگیاں سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ پیچیدگیوں کی وجہ عموماً یہ سمجھی جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کو سیر و سلوک کے معاملات سمجھانا مشکل ہے کیونکہ ان کا تعلق مشاہدے سے ہے اور مشاہدے کی پوری کیفیت الفاظ میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس کی مثال یہ سمجھ لیجیے کہ کسی ایسے منظر کو لفظوں میں پیش کرنا آسان نہیں ہوتا، جو کبھی دیکھا نہ گیا ہو۔ ان دیکھی شے کو

---

[1] رسالہ "اقبال" اکتوبر ۱۹۵۳ء (ص ۹۳)

[2] رسالہ "اقبال" بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء (ص ۹۴)

دیکھی ہوئی چیزوں کی تمثیل کا سہارا لے کر ہی ایک حد تک واضح کیا جا سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ تمثیل کی توضیح جزوًا ہی ذہن نشین ہو سکے گی۔ تاہم میری قطعی رائے ہے کہ بیان میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ فلسفیانہ مصطلحات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اوّلاً فلسفیانہ مسائل کو خواہ مخواہ تصوّف کے مسائل بنا لیا گیا، ثانیاً جو مسائل تصوّف سے متعلق تھے انھیں بھی فلسفیانہ مصطلحات کے ذریعے سے گراں بار اور عسیر الفہم بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ اقبال لکھتے ہیں:

"فلسفیانہ اور مورخانہ اعتبار سے مجھے بعض ایسے مسائل سے اختلاف ہے، جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں مگر جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے۔"[1]

اسلام میں ہندی و یونانی خیالات

اوپر تنزلات ستہ کا ذکر آچکا ہے۔ اقبال مولانا سراج الدین پال کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکّل کے وُہ معنی لیے جاتے ہیں، جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ میں ایّام سے مراد تنزلات ہیں یعنی "فی ستّۃ تنزلات" کمبخت کو یہ معلوم نہیں کہ عربی زبان میں "یوم" کا یہ مفہوم قطعًا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ "تخلیق بالتنزلات" کا مفہوم ہی عربوں کے مذاق اور فطرت کے مخالف ہے۔"

---

[1] رسالہ "اقبال" بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء (ص ۹۴-۹۵)

اس طرح ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیے ہیں۔"[1]

"آب حیات" کے نام سے "زہر"

ایرانی شاعروں نے وحدۃ الوجود کی بنا پر ایک ایسا ذخیرۂ ادبیات فراہم کر دیا جس میں شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ نہایت عجیب و غریب اور بہ ظاہر دلفریب طریقوں سے کی اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایسا لباس پہنا دیا کہ پڑھنے اور سننے والے کے دل میں اس کی برائی کا احساس تازہ ہو جائے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

"اگر اسلام افلاس کو بُرا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں مثلاً:

غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہید عشق فاضل تر از دوست
در روز قیامت ایں بہ او کے ماند
ایں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف، مگر انصاف سے دیکھیے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوب صورت طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے، اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ آب حیات

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول (ص ۴۱)

پلایا گیا ہے۔[1]

خواجہ حسن نظامی کی کوششیں

وحدۃ الوجود کے متعلق اقبال کے افکار خود انھی کے الفاظ میں پیش کر دیے گئے۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم اس سلسلے میں اقبال کی مخالفت کے لیے اتنے سرگرم تھے کہ انھوں نے چند سوالات مرتّب کر کے وقت کے مشایخ کے پاس بھیج دیے غالباً انھیں خیال ہوگا کہ مشایخ کی طرف سے تائیدی تحریریں آجائیں گی تو اقبال کی مخالفت کو خوب تقویت پہنچے گی۔ ان سوالات میں سے بعض یہ تھے:

۱۔ کیا توحید اور وحدۃ الوجود دو جداگانہ اشیاء ہیں؟

۲۔ کیا قرآن شریف عقیدۃ وحدۃ الوجود کا مخالف ہے؟[2]

توحید اور وحدۃ الوجود کی تشریح اوپر اقبال کے لفظوں میں پیش کی جا چکی ہے وہ انھیں دو جداگانہ چیزیں سمجھتے تھے اور حق یہی ہے کہ دو جداگانہ چیزیں تھیں۔ باقی رہا وحدۃ الوجود کو قرآن مجید کے ذریعے سے ثابت کرنا تو خواجہ صاحب کے نہایت معتمد علیہ رفیقوں نے بھی حوصلہ افزا جواب نہ دیا۔ مثلاً اکبر الہ آبادی نے خواجہ صاحب کو لکھا:

> "حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی، مگر اب وہ سنبھل کر مسئلۂ وحدۃ الوجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ میں آپ کو مناسب اور محفوظ جگہ میں نہ پاؤں گا، اگر آپ قرآن مجید سے مسئلہ وحدۃ الوجود کو ثابت کرنے کے لیے قلم اٹھائیں گے۔ علمائے شریعت نے غالباً فرما دیا ہے کہ یہ مسئلہ جزو اسلام نہیں۔"[3]

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول (ص ۳۶، ۳۷)

[2] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۷۸

[3] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۸۰

اسی طرح شاہ سلیمان پھلواری نے جواب میں لکھا:

"اس میں شک نہیں کہ وحدۃ الوجود ایک علمی مسئلہ ہے جسے اصطلاح میں ربط الحادث بالقدیم کہتے ہیں اور تمام کتب الٰہیات میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ اسلامی سیر وسلوک اور مشاہدۂ انوار وتجلیات سے اس کا تعلق تو ضرور ہے مگر مدار نجات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔"[1]

اخلاص فی العمل سے محبّت

چنانچہ خواجہ صاحب کی یہ کوشش بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ حق یہ ہے کہ موصوف کا موقف سراسر غلط اور بے بنیاد تھا۔ یقیناً انھوں نے عوام کے ان جذبات کو بھڑکا کر کار برآری کی کوشش کی جنھیں دین یا تصوف یا اخلاق ہی نہیں، خالص ادبیات سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ اب سرسری طور پر تصوف کے متعلق بھی اقبال کے افکار پیش نظر رکھ لینے چاہئیں، اوپر ایک اقتباس پیش کیا جا چکا ہے، جس میں انھوں نے فرمایا کہ مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی افکار کے زیر اثر ہیں۔ انھیں عربی اسلام، اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے قطعاً شناسائی نہیں۔ ان کے ادبی نصب العین بھی ایرانی ہیں اور مجلسی نصب العین بھی ایرانی۔ اقبال کی آرزو تھی کہ ان ایرانی اثرات سے اسلامی عقاید و افکار اور اعمال و اخلاق کو پاک کر دیں۔ مثنوی میں جہاں کہیں عجمیت سے احتراز اور عربیت کی طرف رجعت کا ذکر آیا ہے، وہاں مقصود ملک عجم اور اس کے باشندے نہیں، بلکہ وہی ایرانی اثرات ہیں، جو اسلامی عقاید و اعمال و اخلاق پر پڑے اور خلاف مقاصد اسلام تھے۔ حقیقی تصوّف سے انھوں نے کبھی اختلاف نہیں کیا، بلکہ وہ اس

---

[1] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۹۷

تصوف کے ، جو اصل اسلام ہے ، جس طرح ابتدا میں شیدائی تھے ، آخری وقت تک شیدائی رہے چنانچہ وُہ فرماتے ہیں :

" اگر تصوّف سے اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوّف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقایق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری رُوح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے "[1]

ظاہر و باطن ایک اور مکتوب میں خان محمد نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں کہ :

" تصوّف کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ دو باب لکھ چکا ہوں یعنی منصور حلاج تک۔ پانچ چار باب اور ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی علامہ ابن جوزی کی کتاب کا وُہ حصّہ بھی شائع کر دوں گا جو انھوں نے تصوّف پر لکھا ہے.... تصوف کے ادبیات کا وہ حصّہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے، نہایت قابل قدر ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ فلسفے کا حصہ محض بیکار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں تعلیم قرآن کے مخالف۔ اسی فلسفے نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صور و اشکال غیبی کے مشاہدے کی طرف کر دی اور ان کا نصب العین محض غیبی اشکال کا مشاہدہ بن گیا حالانکہ اسلامی نقطہ خیال سے تزکیہ نفس کا محض از دیاد یقین و استقامت ہے۔ اخلاقی اور عملی اعتبار سے متصوفین اسلامیہ کی

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول ص ۵۳ ، ۵۴

حکایات و مقولات کا مطالعہ نہایت مفید ہے، لیکن دین کی اصل حقیقت ائمہ اور علما کی کتابیں پڑھنے ہی سے کھلتی ہے۔ آجکل زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ علم دین حاصل کیا جائے اور اسلام کے عملی پہلو کو نہایت وضاحت سے پیش کیا جائے۔ حضرات صوفیہ خود کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر ہے اور تصوّف باطن، لیکن اس پُرآشوب زمانے میں وُہ ظاہر جس کا باطن تصوّف ہے، معرضِ خطر میں ہے۔ اگر ظاہر قائم نہ رہا تو اس کا باطن کس طرح قائم رہ سکتا ہے"[1]

مذہب کا مقصود

حقیقت یہ ہے کہ اقبال قوم کی عملی قوت کو زیادہ سے زیادہ پختہ و استوار رکھنا چاہتے تھے اور ہر اس شے کو مضر سمجھتے تھے جو اس پختگی و استواری میں خلل انداز ہو۔ افسوس کہ جس زمانے میں "اسرارِ خودی" لکھی گئی، اس زمانے کا تصوّف بالعموم عملی قوت میں ضعف پیدا کرنے کا موجب تھا اور آج حالت غالباً اور بھی پریشان کن نظر آتی ہے۔ اقبال کس درد اور سوز سے فرماتے ہیں کہ:

"مذہب کا مقصود عمل ہے نہ کہ انسان کے عقلی اور دماغی تقاضوں کو پورا کرنا۔ اسی واسطے قرآن شریف کہتا ہے: وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً۔ اگر مذہب کا مقصود عملی تقاضوں کو پُورا کرنا ہو بھی، جیسا کہ ہنود کے رشیوں اور فلسفیوں نے خیال کیا ہے، تو زمانہ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے اس کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی، جو اپنی عملی روایات پر قایم رہ سکے گی۔

اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قایم اپنی راہ پہ ہے اور پکّا اپنی ہٹ کا ہے"[2]

---

[1] مکاتیب اقبال ص ۲
[2] مکاتیب اقبال ص ۶

متصوفانہ شاعری

یقیناً اقبال کے دل میں وحدۃ الوجود اور اس کے داعیوں کے متعلق اچھا خیال نہ تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"تصوّف کا سب سے پہلے شاعر عراقی ہے جس نے 'لمعات' میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کو نظم کیا ہے (جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوا الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں ہے اس پر میں اِن شاء اللہ مفصل لکھوں گا) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے)"[1]

انھیں یقین تھا کہ تصوّف کی پوری شاعری مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے دور میں پیدا ہوئی۔ فرماتے ہیں:

"جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سُستی و کاہلی اور اس شکست کو، جو انھیں تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں"[2]

اقبال کا مقام

ان تمام ارشادات سے روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ اقبال اسلام کی درخشاں مشعل اٹھائے ہوئے قوم کو زندگی کے کس راستے پر لگا رہے تھے۔ دنیا نے انھیں شاعر سمجھا، بہت بڑا اور حکیم شاعر، جو ایک خاص پیغام مدت العمر دیتا رہا، لیکن یہ احساس آج تک نہ کیا جا سکا کہ اس کے حقیقی کام کا دائرہ کس درجہ بنیادی، کتنا وسیع اور کس قدر دُور رس تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۴

[2] ایضاً

کہ اقبالؔ کے براہِ راست مخاطب مسلمان تھے، لیکن اس کا پیغام پورے عالم انسانیت کے لیے تھا اور وہ مسلمانوں کو بھی اسی راہ عمل پر پختہ و استوار کر دینا چاہتا تھا جو خدمت انسانیت کے لیے اسلام نے پیش کی تھی ۔ اقبالؔ کا مقام اتنا بلند تھا کہ ہم لوگ آج تک اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکے ۔ یقیناً قدرت صدیوں کے بعد ایسے انسانوں کو دنیا میں بھیجتی ہے جو ماضی اور حال کی ظلمتوں کو چیر کر مستقبل کو صاف صاف ہر شخص کے سامنے روشن کر دیتے ہیں ۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ قرآن مجید کی شان ہے ۔ رسول اللہ صلعم کے اتباع میں قرآن مجید کی صحیح خدمت انجام دینے والے بھی حق کو باطل سے، کھرے کو کھوٹے سے، نیک کو بد سے اور راستی کو کجی سے اسی طرح الگ کر دیتے ہیں کہ کسی کے لیے اشتباہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی ۔ باقی رہے وُہ لوگ جو سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہیں، پھر بھی نیک و بد میں تمیز نہیں کرتے یا نہیں کرنا چاہتے تو ان کے لیے قرآن مجید پہلے ہی فرما چکا ہے کہ ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں ۔ آنکھیں ہیں مگر نہیں دیکھتے ، دل ہیں مگر ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے وہ چوپائے ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر گمراہ ۔

ایک طعنے کا جواب

بہ ہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبالؔ کو حقیقی تصوف سے نہ محض اختلاف تھا بلکہ وُہ اس کے سرگرم حامی تھے ۔ خواجہ حسن نظامی نے خواہ مخواہ اخباروں میں مشہور کر دیا کہ وہ صوفیائے کرام سے بدظن ہیں[1] اور انھیں اپنا موقف واضح کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ مولانا اکبر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"پہلے عرض کر چکا ہُوں کہ کون سا تصوف میرے نزدیک قابل اعتراض ہے ۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وُہ نئی بات نہیں ۔ حضرت علاء الدولہؒ سمنانی لکھ

---

[1] اقبال نامہ حصّہ دوم ص ۵۵

چکے ہیں، حضرت جنیدؒ بغدادی لکھ چکے ہیں۔ میں نے تو محی الدین (ابن عربی) اور منصور حلاج کے متعلق وُہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سمنانیؒ اور جنیدؒ نے ان دونوں بزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ ہاں عقاید و خیالات سے بیزاری ضرور ظاہر کی ہے اگر اسی کا نام مادیّت ہے تو قسم بہ خدائے لایزال مجھ سے بڑھ کر مادہ پرست دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔"[1]

قومی زندگی کے لیے کیسا ادب چاہیے

دیکھیے کتنی صاف اور واضح بات کہی یہ تصوف کی مخالفت نہ تھی بلکہ ان باتوں کی مخالفت تھی، جو مختلف بلند نام اصحاب کے انتساب سے تصوف اور دین میں داخل ہو گئی تھیں، حالانکہ انھیں نہ تصوّف سے کوئی علاقہ تھا، نہ دین سے۔ پھر اقبال کی آرزو تھی کہ قوم از سرِ نو سربلند ہو۔ وہ ایسی ادبیات کے خواہاں تھے، جو طبیعتوں میں ہمّت، جوانمردی اور عزم کار پیدا کریں، عجمی تصوّف نے ایسا ادبی ذخیرہ مہیّا کر دیا تھا، جو طبیعتوں کو پست کرنے والا تھا۔ اقبالؔ خود لکھتے ہیں:

"عجمی تصوّف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اسلامی تصوّف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمان کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔ پیسی مسٹک لٹریچر (قنوطی ادب) کبھی زندہ نہیں رہ سکا۔ قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کا آپٹیمسٹک (رجائی) ہونا ضروری ہے۔"[2]

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۵

[2] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۵-۵۶

خواجہ حافظ

میرے تاثر کے مطابق " اسرارِ خودی" کے خلاف ہنگامہ پیدا کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں خواجہ حافظ کے متعلق اچھی رائے ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ خواجہ حافظ کو اولیاء میں شمار کر لیا گیا تھا اور عام لوگوں کا عقیدہ یہی ہو گیا تھا کہ وہ بڑے بلند پایہ اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ انھیں شاعر سے کہیں زیادہ پارسا مانا جاتا تھا اور یہ معاملہ انھی تک محدود نہ تھا بلکہ اکثر شاعر جن کی کتابیں یہاں کے نصاب میں شامل رہیں، یہی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ حافظ کے اشعار شعرا سے کہیں زیادہ صوفیہ کی مجالس میں پڑھے جاتے تھے اور تصریف و تاویل کا جیسا عمل ان کے دیوان پر جاری ہوا، اس کی مثال شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے، حالانکہ خواجہ موصوف اصلاً شاعر تھے اور ان کے ہاں بھی وہی شراب جا بجا استعمال ہوئی جو میرزا غالبؔ، قاآنی یا دوسرے فارسی اور اردو شعرا کے ہاں مستعمل رہی۔ اقبالؔ خواجہ حافظ کو بہت اچھا شاعر مانتے تھے انھوں نے خود کہا ہے کہ:

از تخیل خلقے پیدا کند

اس سے بڑھ کر کسی شاعر کی تعریف میں کیا کہا جا سکتا تھا؛ لیکن اقبالؔ جس نصب العین کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے تھے، خواجہ حافظ کا دیوان اس پر بہت بُری طرح اثر انداز ہوتا تھا، یعنی وُہ ایسا ادب مہیا کرتا تھا، جو قوم کی ہمّت اور حوصلے کو پست کرے، اس کی عملی قوت کو کھا جائے اور اسے ناکارہ محض بنا دے۔ خواجہ حافظ واقعی بہت بڑے بزرگ بھی ہوتے تو ان کے دیوان کا یہ مضر اثر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور یقیناً قوم کی ترقی و برتری کے مقابلے میں خواجہ حافظ جیسے ہزاروں بزرگوں کو بھی بے تامل قربان کیا جا سکتا تھا۔ اقبالؔ نے حافظ کی تحقیر کے لیے نہیں بلکہ قوم کی سربلندی کے لیے ان کے کلام سے گریز کی تلقین کی۔ یہ پہلو کسی خاص تشریح کا محتاج نہ تھا، لیکن رسم و عادت کے پجاری اس پر مشتعل ہو گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ خواجہ موصوف کے کلام سے گریز کی دعوت دے کر

اقبالؔ نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ نظیری نیشاپوری نے کتنی عمدہ بات کہی ہے:

خلافِ رسم و ریں عہد خرق عادت داں
کہ کارہائے چنیں از شمار بوالعجبی است

خواجہ حسن نظامی، مولانا اکبر الہ آبادی، پیرزادہ مظفر احمد فضلی، حکیم فیروز طغرائی، ملک محمد کاشمیری، ذوقی شاہ اور خدا جانے کون کون سے بزرگ تھے جنھوں نے اس مسئلے میں اقبالؔ کی مخالفت کو اپنا دینی اور قومی نصب العین قرار دے لیا اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کسی کا بھی نقطۂ نگاہ درست نہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم صرف خواجہ حافظ، وحدۃ الوجود اور خودی کا نام لے کر خود بھی پریشان ہو رہے تھے اور دوسروں کو بھی پریشان کر رہے تھے۔ مولانا اکبر الہ آبادی نے سرے سے مثنوی پڑھی ہی نہ تھی اور دوسروں کی ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو گئے تھے۔ بالکل یہی کیفیت باقی اصحاب کی تھی۔ میں ان کے متعلق موقع پر ذرا تفصیل سے ذکر کروں گا۔

اقبالؔ کا موقف

پہلے خواجہ حافظ کے سلسلے میں اقبالؔ کا نقطۂ نگاہ بہ خوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے جو انھوں نے مختلف صورتوں میں بار بار پیش کیا مثلاً وہ مولانا اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں:

"میں نے خواجہ حافظ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔" "اسرار خودی" میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر (رائج) ہے..... خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا، نہ ان کی شخصیت سے۔ نہ ان اشعار میں سے مراد وہ ہے، جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں، بلکہ اس سے وہ حالت سکر مراد ہے جو حافظ کے کلام سے بہ حیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے

چونکہ حافظ ولی اور عارف تصور کیے گئے ہیں، اس واسطے ان کی شاعرانہ حیثیت عوام نے بالکل ہی نظرانداز کر دی اور میرے ریمارک تصوف اور ولایت پر حملے کے مرادف سمجھے گئے۔"[1]

ادبی نصب العین کی تشریح

پھر حافظ محمد اسلم جے راج پوری کو لکھتے ہیں:

"خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے، ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا، خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا، مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں یا مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔"[2]

حالت سکر اسلامی نہیں

انھوں نے اس زمانے میں متعدد مقالات مرتب کیے تھے جو "وکیل" امرتسر یا بعض دوسرے جرائد و رسائل میں شائع ہوئے۔ ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

"میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ خواجہ شیراز محض ایک شاعر ہیں اور ان کے کلام سے جو صوفیانہ حقایق اخذ کیے گئے ہیں وہ بعد کے لوگوں کا کام ہے، مگر چونکہ انھیں عام طور پر صوفی اور مجذوب کامل سمجھا گیا ہے، اس واسطے میں نے ان کی تنقید ہر دو اعتبار سے کی ہے یعنی بہ حیثیت صوفی اور بہ حیثیت شاعر۔ بہ حیثیت صوفی ہونے کے ان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنے آپ

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۴

[2] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۲

ہیں اور دوسروں میں (بذریعہ اپنے اشعار کے) وُہ حالت پیدا کریں جس کو تصوّف کی اصطلاح میں حالت "سُکر" کہتے ہیں۔ ان کے صوفی شارحین نے صہبا و شراب سے یہی مراد لی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا سُکر کی حالت اسلامی تعلیم کا منشا ہے۔ رسول اللہ صلعم اور صحابہ کی زندگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک مسلمان قلب کی مستقل کیفیت بیداری ہے، نہ کہ خواب یا سُکر۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں تو کوئی مجذوب نظر نہیں آتا بلکہ ابتدائی اسلامی لٹریچر میں مجذوب کی اصطلاح بھی مثل بعض دیگر اصطلاحات صوفیہ کے نہیں ملتی۔"

"دوسرا سوال جو حالتِ سُکر کے متعلق پیدا ہوتا ہے، یہ ہے کہ آیا یہ حالت زندگی کے اغراض کے منافی ہے یا مجھ؟ کسی روز فرصت میں یہ ثابت کروں گا کہ علم الٰہیات کے اعتبار سے یہ حالت زندگی کے لیے نہایت ہی مضر ہے اور جو لوگ اس حالت کو مستقل بنا لیتے ہیں، وہ کشمکش حیات کے بالکل قابل نہیں رہتے اور ملّی و قومی اعتبار سے بھی ایسے افراد کا وجود مضرت رساں ہے۔ خالص مذہبی اعتبار سے بھی اس کے مضر ہونے کی مثالیں اسلامی تاریخ میں بہ کثرت ملتی ہیں۔"[1]

حافظ کی ساحری اور دعوتِ مرگ

اس مضمون میں بھی اقبال نے اعتراف کیا ہے کہ حافظ بلند پایہ شاعر تھے جو مقصد دوسرے شعرا پوری غزل سے بھی حاصل نہیں کر سکتے حافظ ایک شعر سے حاصل کر لیتے ہیں، کیونکہ انسانی قلب کے راز کو پوری طرح سمجھتے ہیں، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ انفرادی اور قومی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کون سا معیار ہونا چاہیے؟

---

[1] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۹۵-۹۶

اقبال کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے اشعار اغراض زندگی میں معاون ہیں تو وہ اچھا شاعر ہے۔ اگر وہ اشعار اغراضِ زندگی کے منافی ہیں یا ان سے زندگی کی قوت میں کمزوری اور پستی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے تو وُہ شاعر قومی اعتبار سے مضر ہے۔ ہر شاعر اپنے گرد و پیش کی اشیاء، عقاید، خیالات اور مقاصد کو حسین و جمیل بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ قلوب ان کی طرف کھنچ آئیں۔ ان معنی میں ہر شاعر جادوگر ہے:

"خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے مقصد یا حالت یا خیال کو محبوب بناتے ہیں؟ جو اغراض زندگی کے منافی ہے بلکہ زندگی کے لیے مضر ہے۔ جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ حالت ان افراد و اقوام کے لیے، جو زمان و مکان کی اس دنیا میں رہتے ہیں، نہایت ہی خطرناک ہے۔ حافظ کی دعوت موت کی طرف ہے، جسے وہ اپنے کمال فن سے شیریں بنا دیتے ہیں تاکہ مرنے والے کو دکھ کا احساس نہ ہو۔

ناوک اندازے کہ تاب از دل برد
ناوک او مرگ را شیریں کند"[1]

معیار عمومی حیثیت ہے

جیسا کہ اقبال بار بار کہہ چکے ہیں، انھوں نے نہ تو حافظ کے عام کردار پر کوئی حملہ کیا، نہ انھیں شراب نوش بتایا بلکہ ان کی نجی زندگی کے متعلق کچھ بھی نہ کہا۔ صرف اس نصب العین کو برا بتایا جو صوفی شاعر ہونے کی حیثیت میں حافظ کے پیش نظر تھا یا کہہ لیجیے کہ ان کے اشعار میں نمایاں ہے اور جہاں جہاں اقبال کے اشعار میں حافظ کی صہبا گساری، شراب نوشی

---

[1] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۹۶-۹۷

یا گوسفندی کا ذکر آیا تھا، اس سے مقصود فقط وہ حالتِ سُکر تھی جو حافظ کے دیوان سے پیدا ہوتی تھی اور حافظ کو صرف اس لیے منتخب کیا کہ سُکر اور ادب پیدا کرنے والے گروہ میں وہ سب سے ممتاز تھے گویا اپنے طبقے کے نمائندے تھے۔ نیز ان کا دیوان ہر حلقے میں پڑھا جاتا تھا بلکہ اس سے فال بھی لی جاتی تھی۔

حکیم فیروز طغرائی نے ایک چھوٹا سا رسالہ "لسان الغیب" کے نام سے لکھا تھا۔ اس میں حافظ کے ایسے اشعار پیش کیے تھے، جو جد و جہد اور تحفظ ذاتی کے حامل تھے۔ بالکل یہی کام شیخ مشیر حسین قدوائی نے انجام دیا، جو اس وقت انگلستان میں تھے۔ انھوں نے ایک مضمون بعض اخباروں اور رسالوں میں چھپوایا تھا اور اس مضمون میں دیوان حافظ سے وہ اشعار بہ طور خاص نقل کیے تھے جو خودی اور خودداری کی تائید کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اقبال کا جواب نہ تھا کیونکہ دنیا کے کسی شاعر کا کلام لے لیجیے، تلاش سے اس میں ہر قسم کے مضامین مل ہی جائیں گے۔ سوال منتخب اشعار کا نہ تھا، بلکہ کلام کی عمومی حیثیت اور اثر کا تھا۔ اقبال کیا خوب لکھتے ہیں:

> "میری تنقید پر رائے زنی کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ حافظ شیرازی مسلمان تھے اور ان کے رگ و ریشہ میں اسلام تھا۔ وجودی تصوف نے ان کے نقطۂ نظر کو کتنا ہی تبدیل کیوں نہ کر دیا ہو۔ ممکن نہیں کہ کبھی صحو سُکر پر غالب نہ آتا ہو اور وہ ایسے اشعار نہ لکھتے ہوں..... غور کریں گے تو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ بہ حیثیت مجموعی خواجہ حافظ کا اخلاقی نصب العین حالتِ سُکر ہے نہ کہ حالت صحو اور کسی شاعر کی تنقید کے لیے اس کے عام نصب العین ہی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔"[1]

---

[1] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۲۳ء ص ۹۷

فوق کو جواب

حافظ کے سلسلے میں اقبال پر اعتراض کرنے والوں میں ایک منشی محمد دین فوق مرحوم بھی تھے، جو اقبال کے عزیز دوست تھے۔ کچھ مدت بعد منشی صاحب کی کتاب "وجدانی نشتر" اقبال کے پاس پہنچی تو اس میں ایک قصہ درج تھا کہ عالمگیر نے طوائفوں کو نکاح کر لینے کا حکم دے دیا، ساتھ ہی کہہ دیا کہ مقررہ مدت کے اندر اس حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو سب طوائفوں کو کشتی میں بھر کر دریا برد کر دوں گا۔ ایک حسین طوائف شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے سلام کو جایا کرتی تھی۔ بادشاہ کا حکم مل جانے کے بعد وہ آخری سلام کے لیے حاضر ہوئی۔ شیخ نے حقیقت حال دریافت فرمائی۔ طوائف نے بادشاہ کا حکم سنا دیا۔ شیخ نے فرمایا: حافظ کا حسب ذیل شعر یاد کر لو:

در کوے نیک نامی مارا گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

تمھیں دریا کی طرف لے چلیں تو بہ آواز بلند یہی شعر پڑھتی ہوئی جانا۔ طوائفوں نے اسی پر عمل کیا بادشاہ کے کان میں آواز پہنچی تو بے تاب ہو گیا اور حکم دے دیا کہ سب کو چھوڑ دیا جائے۔

یہاں سوال اس قصے کی تاریخی حیثیت کا نہیں، اقبال اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"منشی صاحب کے نزدیک جو حافظ کا حسن ہے، میرے نزدیک وہی اس کا قبح ہے۔ مسئلہ تقدیر کی ایک غلط مگر دل آویز تعبیر سے حافظ کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور نیک نیت بادشاہ کو، جو آئین حقہ شرعیہ اسلامیہ کی حکومت قایم کرنے اور زانیات کا خاتمہ کر کے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو اس بدنما داغ سے پاک کرنے میں کوشاں تھا، قلبی اعتبار سے اس قدر ناتواں کر دیا کہ اسے قوانین اسلامیہ کی تعمیل کرانے کی ہمت ہی

نہ رہی۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ یہ داستان ہی سراسر بے اصل و بے بنیاد ہے۔

غلط بیانات خواجہ حسن نظامی نے ایک عجیب حرکت یہ کی کہ حافظ کے متعلق اقبال کے اشعار کا ترجمہ اردو میں کیا تو اسے خلافِ حقیقت شکل دے دی اور ایسی تعبیرات شامل کر دیں جن کے لیے اصل میں کوئی بھی گنجایش نہ تھی مثلاً اقبال نے حافظ کے متعلق لکھا تھا:

در محبت پیرو فرہاد بود　　بر لب او شعلۂ فریاد بود
تخم نخل آہ در کہسار کاشت　　طاقتِ پیکار با خسرو نداشت

دوسرے شعر کا ترجمہ خواجہ صاحب نے یہ کیا:

"آہوں کے درخت جنگل میں بوتا تھا۔ اس میں بادشاہوں سے لڑنے کی طاقت نہ تھی۔"

حالانکہ خسرو کا لفظی ترجمہ "بادشاہوں" نہیں "بادشاہ" ہونے چاہیے تھا اور جس "خسرو" کو "فرہاد" سے تعلق تھا وہ ایک مختص شخص تھا اور اس کے نام کا ترجمہ بالکل غیر مناسب تھا۔

دیباچے میں، جس کے اقتباسات اوپر دیے جا چکے ہیں، اقبال نے یہ بھی کہا تھا کہ حکمائے انگلستان کی تحریروں سے مستفید ہو کر مسلمانوں کو اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

خواجہ حسن نظامی نے اس مفہوم کو یوں پیش کیا:

۱۔ "اہلِ مشرق اور مسلمان، یورپ کے فلاسفروں کی پیروی کریں اور اپنے قدیمی عقاید بدل دیں؛

---

[1] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۹۸-۹۹

۲۔ اہل مغرب خصوصاً جرمنی اور انگلستان کے فلاسفروں کی قصیدہ خوانی کر کے مشرق والوں علی الخصوص مسلمانوں کو ہدایت ہوئی ہے کہ اپنی قدیمی روایات پر نظر ثانی کریں اور ان یورپین رہنماؤں کی تعلیم سے اپنے دل و دماغ کو روشنی پہنچائیں۔

ظاہر ہے کہ یہ اقبال کے نقطہ نگاہ کی کھلی ہوئی تحریف تھی پھر عجیب امر یہ ہے کہ جب بعض مسلمان صوفیہ نے افلاطونیت جدیدہ کو اپنا لیا جو دلوں کو سخت پست کرنے والی اور اخلاقی نقطۂ خیال سے نہایت مضر تعلیم تھی تو حکمائے انگلستان یا حکمائے جرمنی کے فلسفے کی روشنی میں اپنی فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کیوں گناہ ہوئی ؛ نیز ظاہر ہے کہ فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کرنا تبدیلی عقاید کو مستلزم نہیں۔

مولانا اکبر الہ آبادی

اقبال نے انھیں لکھا تھا کہ آپ میرے ساتھ ناانصافی نہ کریں۔ بحث علمی انداز میں ہونی چاہیے یعنی مقصود یہ ہو کہ حریف قائل ہو کر راہِ راست پر آجائے، یہ نہ ہو کہ اسے بدنام کیا جائے[1] مولانا اکبر یقیناً ابتدا میں خواجہ حسن نظامی کی تحریرات کے زیر اثر "اسرار خودی" سے بدظن ہو گئے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے پوری "اسرارِ خودی" پڑھی بھی نہ تھی۔ چنانچہ اقبال ۱۱۔جون ۱۹۱۸ء کے ایک مکتوب میں مولانا اکبر کو لکھتے ہیں:

"مجھے آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے مثنوی "اسرار خودی" کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں، جو حافظ کے متعلق لکھے گئے تھے، باقی اشعار پر نظر شاید نہیں فرمائی۔ کاش آپ کو ان کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی تاکہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔"[2]

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۰

[2] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۵

عجیب امر یہ ہے کہ اکبر کے اپنے خیالات بھی اصولاً اقبال سے مختلف نہ تھے چنانچہ وہ خود ایک نظم میں مسلمانوں کے متعلق فرماتے ہیں:

ان میں باقی ہے کہاں خالدؓ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ[1]

خالدؓ جانباز یقیناً اسلامی قوت عمل اور ہمت و شجاعت کا نہایت قابل قدر پیکر تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلے میں جس رنگ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ واضح طور پر عمل اور ہمت و شجاعت کی نفی تھا۔ اقبال کے بیان کے مطابق مولانا اکبر نے مثنوی کے اشعار اور اس کے دینی مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے پرائیویٹ خط میں فرمایا تھا:

"آپ کے (اقبال کے) مطمح نظر جو امر ہے، اگر میں اس کی قدر نہ کروں تو مسلمان نہیں۔"

ذوقی شاہ، فضلی اور ملک محمد

اختلاف کرنے والوں میں سے حکیم فیروز طغرائی، اکبر الہ آبادی، خواجہ حسن نظامی اور شیخ مشیر حسین قدوائی کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ ذوقی شاہ، پیرزادہ مظفر احمد فضلی اور ملک محمد کاشمیری نے بھی مخالفت میں سرگرم حصہ لیا تھا لیکن ان سب کے اختلاف کی حیثیت "سوال از آسماں اور جواب از ریسماں" کے مترادف تھی یعنی اقبال نے کچھ کہا تھا اور ان حضرات نے کچھ اور ہی فرمایا۔ ان میں سے پیرزادہ مظفر احمد صاحب فضلی ڈپٹی کلکٹر انہار کو فارسی شاعری میں بلند حیثیت حاصل تھی۔ ان کے فارسی کلام کا ایک مجموعہ "گلبانگ سخن" کے نام سے ۱۹۰۵ء میں چھپ چکا تھا۔ انھوں نے "ساز بیخودی" کے نام سے ایک مثنوی شائع کی جس میں اصل بحث کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ پوری مثنوی افلاطون اور حافظ کی مدح

---

[1] رسالہ اقبال بابت اپریل ۱۹۵۴ء، ص ۵۶

اور اقبال کی قدح کے لیے وقف کر دی۔ شعر اچھے ہیں لیکن مضمون بے سروپا اور اصل مبحث سے یک قلم بے تعلق۔ یہ سب کچھ شائع ہُوا اور ناپید ہو گیا۔ آج ان چیزوں کو تلاش کیا جائے تو ایک بھی شاید ہی مل سکے۔ اقبال کی "اسرار خودی" اور باقی تمام چیزیں زمانے کی آنکھوں کے لیے کحل الجواہر بنی ہُوئی ہیں اور قرآن مجید کے اس اصول کی تازہ شہادت پیش کر رہی ہیں:

وَ اَمَّا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (سورہ رعد)[1]

مسئلہ انتساب

اعتراضات کے سلسلے میں صرف ایک چیز باقی رہ گئی یعنی "اسرار خودی" کا انتساب۔ "اسرار خودی" سر علی امام سے منسوب کی گئی تھی جو پٹنہ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے اور بعد میں دولت آصفیہ کے صدر اعظم بھی ہو گئے تھے۔ وُہ اقبال کے عزیز دوست تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے کہا کہ مثنوی کو سر علی امام سے نامزد کر کے اقبال نے اپنی خودی پر چوٹ لگائی ہے۔ اقبال نے اس کے جواب میں فرمایا کہ خواجہ صاحب شاید انتساب کے معنی نہیں سمجھتے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے:

> "اس سے مراد محض اظہارِ محبت و اخلاص ہے، جو دو آدمیوں کے ذاتی تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔ میں نے ان اشعار میں ڈیڈیکشن (انتساب) کی وجہ صاف لکھ دی ہے۔ آپ ان اشعار کو غور سے پڑھتے تو خود بخود یہ بات معلوم ہو جاتی۔"[2]

سر علی امام کے ساتھ اقبال کے تعلقات پہلے سے دوستانہ تھے چنانچہ ایک مرتبہ لوگوں نے نائباً مزاحاً مولانا گرامی کو دھمکی دی کہ آپ کی پنشن بند کرا دی جائے گی۔ اقبال کو

---

[1] اور جس چیز میں انسان کے لیے نفع ہو وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

[2] رسالہ اقبال بابت اپریل ۱۹۵۴ء، ص ۵۴-۵۵

اس واقعے کی اطلاع ملی تو خان محمد نیاز الدین خاں کو لکھا کہ یہ اچھا نسخہ ہاتھ آیا ہے۔ اب مولانا گرامی کو لاہور بلانے کے لیے اِن شاء اللہ یہی نسخہ استعمال کیا جائے گا۔

"ان کو (مولانا گرامی کو) معلوم ہوگا سید علی امام وہاں (حیدر آباد) بہ حیثیت صدر اعظم پہنچ گئے ہیں اگر وُہ (گرامی) لاہور نہ آئے تو میں انھیں (سر علی امام کو) ضرور لکھوں گا کہ گرامی کی پنشن بند کی جائے اور ان کی عرضیوں کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔"[1]

اکبر کی رائے بھی سر علی امام کے متعلق قابلِ ملاحظہ ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں کہ علی امام سے ملیں تو آداب عرض کر دیں بہ صد شوق ملاقات:

"بعض علماء کا خیال ہے کہ نیکی اور عقل مندی ایک ہی چیز ہے۔ سر علی امام کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ بہت شیریں نفس شخص ہیں۔"[2]

"اسرارِ خودی" کے دُوسرے ایڈیشن میں اقبال نے جہاں اور ترمیمیں کیں، وہاں مندرجہ ذیل ترمیمیں بھی کر دیں، جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ خواجہ حافظ کے متعلق اشعار حذف کر دیے اور ان کی جگہ "درحقیقت شعر و اصلاح ادبیاتِ اسلامیہ" کے زیرِ عنوان نئے شعر شامل کر دیئے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اقبال کی رائے خواجہ حافظ کے متعلق بدل گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ جس مقصد کے پیشِ نظر وہ اشعار لکھے گئے تھے، لوگوں کی غلط فہمی کی بنا پر وہ مقصد فوت ہو رہا تھا اور مصلح کی شان یہی ہوتی ہے کہ اصل مقصد یعنی اصلاح کو تمام دوسری مصلحتوں پر مقدم رکھے۔

---

[1] مکاتیبِ اقبال ص ۴۱

[2] خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی ص ۲۱

۲- دیباچہ حذف کر دیا۔

۳- انتساب کے تمام اشعار مثنوی سے الگ کر دیے۔

چنانچہ وہ مولانا اکبرؔ کو لکھتے ہیں:

"اسرارِ خودی" میں حافظ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اسے خارج کر کے اور اشعار لکھے ہیں..... ان اشعار کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی اور میرا اصل مطلب واضح ہو جائے گا۔"[1]

مولانا اسلم جے راج پوری کو بھی یہی لکھا اور فرمایا کہ حافظ والے اشعار کی جگہ اس لٹریری اصول کی تشریح کی ہے، جسے میں صحیح سمجھتا ہوں:

"دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا جیسا کہ مجھے بعض احباب کے خطوط سے اور دیگر تحریروں سے معلوم ہوا جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔"[2]

آخر میں اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ اقبال نے "رموزِ بیخودی" کا بھی مختصر سا دیباچہ لکھا تھا، جو صرف پہلی اشاعت کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱- جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت و دفع مضرت، تعیین عمل و ذوق حقائق عالیہ احساس نفس کے تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بہ الفاظ دیگر قومی "انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے۔

۲- حیات ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افراد قوم کسی آئین مسلّم کی پابندی سے اپنے

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۶

[2] اقبال نامہ حصہ اول ص ۵۳

ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں" تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر پوری قوم کے لیے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے۔

۳۔ افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوت حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی "تاریخ حیات ملیہ کے لیے بہ منزلہ قوت حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حیات و اعمال کو مربوط کر کے قومی "انا" کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔

۴۔ علم الحیات اور عمرانیات کے اسی نکتے کو مدنظر رکھ کر میں نے ملت اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ امت مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۵۔ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص الہیت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اس کی زندگی مضبوط و محکم بنانے کے عملی اصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آچکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔

اقبال تیسرا حصہ نہ لکھ سکے تاہم ان کی تصانیف کے ہر حصے میں اس سوال کا جواب حقیقۃً پوری تفصیل سے آگیا اور "اسرار و رموز" میں بھی جا بجا اس کا جواب موجود ہے۔

مقدمہ "مطالب اسرار و رموز"

پیامِ مشرق

پیرِ مغرب شاعرِ المانوی — آں قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی
بست نقشِ شاہدانِ شوخ و شنگ — داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغامِ شرق — ماہ تابے ریختم بر شامِ شرق

علامہ اقبال کی تازہ ترین تصنیف "پیامِ مشرق" کے متعلق ان صفحات پر ایک سے زائد بار تذکرہ آچکا ہے۔ ہم نے اس کی زیورِ طبع سے آراستگی و پیراستگی کی اطلاع دیتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اس کے متعلق تفصیل سے کسی دوسرے موقع پر اظہارِ خیالات کریں گے چنانچہ آج اس وعدے کو پورا کرتے ہیں۔

یہ ابتدا ہی میں عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ یہ مضمون اس نادرۂ روزگار مجموعہ حقائق و معارف کے محاسن و مطالب کی تمام و کمال وضاحت سے قاصر ہے اور صرف ایک آدھ مضمون اس کے حقیقی خد و خال کی پرورد اور حیات آموز خوبیوں کے وضوح و انشراح کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ایک طویل اور مبسوط سلسلۂ مضامین کی ضرورت ہے اور ہمارے پیشِ نظر فرصت و گنجائش اس بسط و تفصیل کی متحمل نہیں۔ اس مضمون کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ قارئین کرام کو "پیامِ مشرق" کی حیثیت و اہمیت کا ایک عام اندازہ ہو جائے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ علامہ ممدوح کے ندرت زا تخیل نے اس سرزمین میں کیا کیا گل کاریاں کی ہیں اور حقائق و معارف حیات کی کن کن گہرائیوں میں غواصی کی ہے۔

"پیامِ مشرق" سات حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ دیباچہ ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کن وجوہ و اسباب کی بنا پر گوئٹے خواجہ حافظ دیوان کے ترجمے سے متاثر ہوا اور اس نے خواجہ کے انداز کو اختیار کرتے ہوئے اپنا "مغربی دیوان" مرتب کیا جس کے جواب میں زیرِ انتقاد

کتاب لکھی گئی۔ دیباچہ نثر میں ہے۔

دوسرے حصے سے نظم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصے کو پیش کش کے نام سے موسوم کرنا موزوں ہوگا، کیونکہ اس میں پیامِ مشرق کو ضیغم اسلام اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان غازی تاجدارِ دولت مستقلہ افغانستان کے نام نامی پر معنون کیا گیا ہے۔ ہم اس پیش کش کے نصف سے زائد اشعار اپنی چار مئی کی اشاعت میں ہدیہ قارئین کر چکے ہیں جن سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مشرقی دنیا کے اس سب سے بڑے فلسفی، حقائق حیات کے اس سب سے بڑے ماہر اور دورِ حاضر کے اس سب سے بڑے شاعر نے کس اچھوتے اور دلکش انداز میں اعلیٰ حضرت امیر غازی کو عملی سیاست کے حقائق بتلائے ہیں اور کس طرح انہیں افغانوں کی غیور قوم کی تہذیب و ترتیب پر متوجہ کیا ہے۔

تیسرے حصے میں اصلی کتاب شروع ہوتی ہے۔ یہ حصہ "لالۂ طور" کے نام سے موسوم ہے اور اسی صفحات پر مشتمل ہے اس میں ایک سو پچپن رباعیات ہیں جن میں حکمت، فلسفہ، تمدن، معاشرت یا بہ اصلاح جامع زندگی اور حیات کے اسرار بیان کئے گئے ہیں۔ اور کوئی رباعی ایسی نہیں جو از سرتاپا درسِ عمل اور درسِ حیات نہ ہو مثلاً ارشاد ہوتا ہے۔

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے   تنے محکم تراز سنگیں حصارے
درون او دل دردآشنائے   چو جوئے در کنارے کوہسارے

ہم نہیں سمجھتے کہ زندگی کی اس سے بہتر اور کیا تفسیر ہو سکتی ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

دل بے باک را ضرغام رنگ است   دل ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است   اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

ہندوستان کی سرزمین میں جس شخص کی نظر سب سے پہلے وحدتِ اسلامی کی حقیقت پر پہنچی اور جس نے سب سے پہلے یہاں وطن، نسل، رنگ اور خون کے غیر اسلامی رشتوں کو توڑ کر مذہب کی صحیح اسلامی اساس قومیت کی دعوت دی وہ علامہ اقبال ہیں آج ہندوستان

کے مختلف حصّوں میں وحدت اسلامی کی دعوت کے جو بڑے بڑے آتش کدے روشن ہیں وُہ سب اپنی تپش، سوز اور حرارت کے لیے علاّمہ ممدُوح کے مرہونِ منت ہیں۔ مسلمان بچّوں کے قومی گیت سے لے کر مثنویوں تک علاّمہ ممدُوح کی ایک نظم بھی ایسی نہیں جس میں یہ دعوت مؤثر سے مؤثر انداز میں موجود نہ ہو۔ "پیامِ مشرق" کے زیرِ انتقاد حصّے میں اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :-

تو اے کودک منش خود را ادب کن　　مسلماں زادۂ ترکِ نسب کن
برنگ احمرو خون و رگ و پوست　　اگر نازد عرب ترک عرب کن

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

بہرحال ہم عرض کر چکے ہیں کہ مفصّل انتقاد کا یہ موقع نہیں۔ اس لیے محض اشارات پر اکتفا کر رہے ہیں اور صرف ایک رُباعی اور یہاں درج کرتے ہیں جو علاّمہ ممدُوح کے اشعار کی حقیقت کا آئینہ ہے۔ کاش مخاطب سمجھے۔

بخود باز آورد رندِ کہن را　　مئے برنا کہ من در جام کردم
من ایں مے چوں مغاں دِر پیشیں　　ز چشم مست ساقی دام کردم

"پیامِ مشرق" کے چوتھے حصّے کا نام "افکار" ہے جس میں مختلف مضامین پر چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ بڑی بڑی نظموں میں تسخیرِ فطرت، نوائے وقت، بہار، دنیائے عمل، زندگی وغیرہ نہایت نادر چیزیں ہیں۔ یہ حصّہ تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ بہار اور شبنم پر جو نظمیں ہیں ان کی بحریں بالکل نئی ہیں مثلاً بہار کا پہلا بند یہ ہے۔

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنّم ھزار
طوطی و دراج و سار

برطرف جوئبار
کشت گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

غلامی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد — گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگان خوار تراست — من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

پانچواں حصہ "مے باقی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ غزلیات پر مشتمل ہے جن میں سے ایک غزل ہم اپنی کسی قریبی اشاعت میں شائع کر چکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان کے نہج انداز اور مطالب کی کیا حالت ہے۔ خود علامہ ممدوح نے ایک مقام پر اپنی غزلوں کی حقیقت نہایت عمدہ طریقے سے بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم — غزل سرائم و پیغام آشنا گویم

اس حصے میں بھی زندگی کے وہ تمام حقائق و اسرار بدرجہ اتم موجود ہیں جو نظموں اور رباعیات کی جان ہیں، اگر رباعیات میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" تو غزلیات کے سفینہ میں بھی گوہر ہیں۔

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است — سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است
چو موج ساز وجودم ز سیل بے پرواست — گمان مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم
رمز حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی — در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را
تنش از سایہ بال تدروے لرزہ میگیرد — چو شاہیں زادہ اندر قفس با دانہ میسازد

کہیں کہیں ان موتیوں کی آب و تاب بہت تیز ہو گئی ہے :۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست — با من میا کہ مسلک شبیرم آرزوست

گفتند لب بہ بند ز اسرار ما بگو　　گفتم کہ خیز! نعرۂ تکبیر م آرزوست

چھٹے حصّے کا نام "نقش فرنگ" ہے جس میں مغربی سیاسیات، مغربی مسائل، مغربی شعراء، مغربی حکماء وغیرہ پر نظمیں ہیں اور شوپن ہار، نیٹشا، ٹالسٹائے، کارل مارکس، ہیگل، آئن سٹائن، برگسان کانٹ وغیرہ کے فلسفہ اور بائرن، براؤننگ وغیرہ کی شاعری کی حقیقت کو اس طرح ایک ایک دو دو شعروں میں بیان کر دیا ہے۔ کہ جن لوگوں کی عمریں ان میں سے ایک ایک شخص کی مصنفات کے مطالعہ میں کامل انہماک و اشتغال کے ساتھ بسر ہو چکی ہیں وہ بھی ان کا خلاصہ اس سے بہتر بیان نہیں کر سکتے۔ نٹشا کے متعلق ایک مقام پر دو شعر لکھے:۔

از سستی عناصر انساں دلش تپید　　فکر حکیم پیکر محکم تر آفرید

افگند در فرنگ صد آشوب تازہ　　دیوانۂ بکار، گہ شیشہ گر رسید

نٹشا کے متعلق اس سے بہتر کیا لکھا جا سکتا تھا؟ دوسرے مقام پر نٹشا کی ساری زندگی کو ایک شعر میں بند کر دیا ہے:۔

آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت　　قلب او مومن دماغش کافر است

"نقش فرنگ" میں جمعیۃ الاقوام کے متعلق جو شعر لکھے ہیں وہ بطور خاص قابلِ ملاحظہ ہیں۔ اور غالباً جمعیۃ الاقوام کے آغاز سے اس وقت تک کسی چھوٹے بڑے مضمون نظم و نثر میں اس کی حقیقت اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں:۔

برفتند تا روشِ رزم دریں بزم کہن　　دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند

من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

"پیامِ مشرق" کے ساتویں حصّے کا نام خردہ ہے جس میں متفرق اشعار ہیں یہ پیامِ مشرق کا نامکمل سا خاکہ ہے جس سے قارئین کرام کو اس کی حقیقت و اہمیت کا اندازہ کرنے میں کچھ مدد مل سکے گی۔ اگر آج اقبال یورپ کے کسی ملک میں ہوتا تو اس کی ایک ایک نظم موتیوں سے تلتی لیکن قدرت نے اسے ایک غلام، محکوم اور اپنی اصل سے دُور افتادہ قوم کی حقیقی زندگی

کی راہ دکھانے اور اسے اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرانے کے لیے ہندوستان میں پیدا کیا۔ وہ موتیوں کا طالب نہیں ہے، گوہروں کا آرزومند نہیں ہے دولت اور عزوجاہ کا خواہاں نہیں ہے۔ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی بربط وجود سے زندگی کی جو نوا نکلی ہے لوگ اس کو حقیقت سمجھیں اور جو صحیح اور سچا اسلامی راستہ دکھا رہا ہے اس کی پیروی کریں۔

اغیار علامہ ممدوح کے حیات پرور افکار عالیہ سے استفادہ کر رہے ہیں اور "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ اس وقت شاید تیسری دفعہ چھپ رہا ہے کاش ان لوگوں کی بھی آنکھیں کھلیں جن کے لیے یہ چیزیں لکھی گئی ہیں اور جن کی خاطر علامہ ممدوح خون جگر کھا رہے ہیں۔

(زمیندار ۳۱ مئی ۱۹۲۳ء)

سرودِ رفتہ

اقبالؒ نے بانگِ درا مرتب فرماتے وقت اپنے اردو کلام کا خاصا بڑا حصّہ قلم انداز کر دیا تھا۔ اس طرح ان کی بہت سی نظمیں اور ردو سے اشعار عام شائقین کی دسترس سے باہر نکل گئے، جنھیں ان کی سخن گوئی کے اوائل میں ملک کے مختلف رسالے بڑے فخر سے چھاپتے تھے اور 'مخزن' کے لیے تو سب سے زیادہ گراں قدر سرمایہ انھی کا کلام تھا پھر متروکہ نظموں میں سے متعدد انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھی گئی تھیں، جن کی عظمت و شان پاک و ہند کے ہر حصّے سے اصحاب علم و فضل کو کھینچ لاتی تھی اور بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آج سے پچاس پچپن سال پیشتر تک ایسے اجتماعات اس وسیع سرزمین میں بہت کم ہوتے تھے۔

انھی نظموں سے مرحوم کی عالمگیر شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ کلام خود ان کے نزدیک بھی ایک زمانے میں قابل قدر ہی ہوگا ورنہ اسے چھپنے کے لیے کیوں دیتے یا انجمن کے جلسوں میں کیوں پڑھتے؟

ابتدا ہی سے اقبالؒ کا دستور یہ تھا کہ انجمن میں پڑھنے کے لیے جو نظم لکھتے تھے اسے چھپوا لیتے تھے۔ نظموں کی چھپی ہوئی کاپیاں قدر دان اصحاب جلسے ہی میں خاصی بڑی رقمیں دے کر خرید لیتے تھے۔ اس طرح انجمن کو معقول رقم ان مطبوعہ نظموں سے بھی مل جاتی تھی عام چندہ ان کے علاوہ تھا چنانچہ اس قسم کے واقعات کا ذکر انجمن کی رپورٹوں میں بھی جا بجا ملتا ہے اور خود اقبالؒ کی ایک نظم میں بھی ایسے اشارے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظمیں پڑھنے سے پیشتر چھپوا لیتے تھے۔ میرے علم کی حد تک صرف ایک نظم ہے جو پڑھنے سے پیشتر طبع نہیں کرائی گئی تھی اور وہ 'شکوہ' ہے جس سال 'شکوہ' پڑھا گیا انجمن

حمایت اسلام کا جلسہ ریواز ہوسٹل کے صحن میں ہوا تھا۔ ہوسٹل کے دروازے میں کھڑے ہوں تو صحن کے دائیں جانب آخری حصے میں سٹیج آراستہ کی گئی تھی۔ اقبال نے انجمن کے جلسوں میں نظمیں پڑھنے کی ابتداء ۱۹۰۰ء میں کی اور سب سے پہلے "نالۂ یتیم" پڑھی۔ ۱۹۰۱ء میں "یتیم کا خطاب ہلال عید سے"، ۱۹۰۲ء میں "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے"، ۱۹۰۳ء میں "ابر گہربار" جو "فریاد امت" کے نام سے معروف ہوئی اور ۱۹۰۴ء میں "تصویر درد" جس کا پہلا شعر یہ ہے:

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

۱۹۰۵ء میں کوئی نظم نہ پڑھی اور اسی سال اگست میں وُہ ولایت چلے گئے جہاں تین سال گزار کر ۱۹۰۸ء میں آئے واپس آکر بھی انھوں نے تین سال تک کوئی نظم نہ پڑھی گویا "تصویر درد" کے بعد جو پہلی نظم انجمن کے جلسے میں سنائی وہ "شکوہ" تھی۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں اسے سننے کے لیے جمع ہوئے تھے ان کی پہلی نظمیں بھی ندرت ترتیب و افکار، یگانگی تاثیر و نفوذ اور حسن بیان و پیشکش کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوتی تھیں لیکن "شکوہ" اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری نظم تھی۔ نہ اس کی کوئی مثال پہلے موجود تھی نہ بعد میں مہیا ہو سکی۔

غور فرمائیے جب آپ سنیں گے کہ کوئی شاعر خدا کی بارگاہ میں امت کی طرف سے شکوہ و شکایت لے کر آیا ہے تو آپ کے ذہن میں نظم کا کیا نقشہ جمے گا؟ یہ کہ امت نے دین کی خدمت میں فلاں فلاں کارنامے انجام دیے مگر ان کا صلہ یہ ملا کہ امت درجہ بدرجہ تنزّل پذیر ہوتی رہی یہاں تک کہ انتہائی پستی میں پہنچ گئی۔ اس سے پیشتر خواجہ حالی مرحوم "شکوۂ ہند" لکھ چکے تھے جس میں اپنی تباہی، اپنے ابتدائی اوصاف حسنہ کی بربادی اور گریہ و ماتم کے سوا کچھ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی نظمیں سُن کر قوم کے عزم و ہمت اور جوش و

سرگرمی پر افسردگی ہی طاری ہو سکتی تھی لیکن اقبالؔ کا "شکوہ" ملاحظہ فرمایئے اس کا ہر بند امت کے ان عظیم الشان کارناموں کا داستاں سرا ہے، جن سے گراں بہا تر کارنامے تاریخ کے صفحات پر ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتے۔ تاہم انھیں ایسے انداز میں آراستہ کیا گیا ہے کہ شکوے کا حق بھی ادا ہوتا جا رہا ہے اور سامع کے دل پر افسردگی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑتی، بلکہ اس کا عزم زیادہ سے زیادہ مستحکم، اس کی ہمت زیادہ سے زیادہ بلند، اس کا جوشِ عمل زیادہ سے زیادہ بے پناہ صورت اختیار کرتا جا رہا ہے مثلاً:

تجھے ہمیں اک ترے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

تُو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے — شہر قیصر کا جو تھا، اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ — کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی دلدار نہیں؟

دیکھیے ہر بند شکوے پر مبنی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان کی حقیقی شان کیا ہے؟ اس کائنات میں اس کے وظائف کیا ہیں؟ مجمع انسانیت میں ملتِ بیضا کا مقام کیا ہے؟ قرآن مجید میں اسے اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى

النّاسِ[1] قرار دیا تو کیوں قرار دیا؟ پھر وہی پہلو منتخب کیے جو جماعتی اور قومی زندگی میں حقیقی اسلامی پہلو تھے اور جن کی برکت سے اسلافِ کرام نے تاریخِ انسانیت میں بلند ترین مرتبہ حاصل کیا مثلاً:

کون سی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی؟ اور تیرے لیے زحمت کشِ پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاندار ہوئی؟ کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟
منہ کے بل گر کے ہو اللہ احد کہتے تھے

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟
دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

جب مسلمانوں کی پریشان حالی کا ذکر فرماتے ہیں تو دیکھیے کیا انداز اختیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صرف مسلمان ہی گنہگار نہیں دوسری قومیں بھی گنہگاری کے داغوں سے پاک نہیں۔ ان میں عاجز بھی ہیں، مغرور و متکبر بھی۔ کاہل بھی ہیں اور غافل بھی۔ ایسے بھی ہیں جو خدا کے نام تک سے بیزار تک ہیں لیکن ان سب پر رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے اور بجلی صرف

---

[1] یعنی تمھیں بہترین امت ہونے کا درجہ عطا فرمایا تاکہ تم انسانوں کے لیے (سچائی کی) گواہی دینے والے ہو۔

مسلمانوں پر گرتی ہے۔

پھر اپنی زبان سے نہیں بتوں کی زبان حال کے ترجمان بن کر فرماتے ہیں:

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں، مسلمان گئے ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے اپنی لیلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ نظم ہر اعتبار سے نرالی اور یگانہ تھی، آغاز و انجام کے بعض بند چھوڑ کر جن میں دوسرے مطالب ہیں اس نظم کا ہر بند بہ یک وقت شکوہ بھی ہے، اسلامی کارناموں کا داستان سرا بھی اور حقیقی اسلامی شیوؤں کی جانب پُر تاثیر دعوت بھی۔ ایسی معجز نما شاعری کی مثالیں کہاں ملیں گی؟

ہزاروں آدمی اسے سننے کے لیے آئے تھے۔ اقبال نے پہلے ایک قطعہ سنایا جس کا آخری شعر یہ تھا:

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

پھر نظم سنانے لگے تو حاضرین نے اصرار کیا کہ ترنم سے سنائی جائے جیسا کہ وہ ابتدا سے اپنی تمام نظمیں ترنم سے سناتے رہے تھے اور "شکوہ" کے بعد "شمع اور شاعر"، "خضر راہ" اور "طلوعِ اسلام" ترنم ہی سے سنائی گئی تھیں۔ اقبال نے فرمایا: میں نہیں جانتا ہوں نظم پڑھنے کا کون سا طریقہ موزوں ہے۔ یہ نظم ترنم سے نہیں پڑھی جا سکتی چنانچہ تحت اللفظ ہی پڑھی اور انداز اس درجہ دل آویز تھا کہ جن خوش نصیبوں نے یہ سنی، وہ زندگی کے آخری لمحے تک اسے بھولے ہوں گے اور نہ بھولیں گے۔ اس نظم کی کاپی اقبال نے اپنے قلم سے لکھ کر لائے تھے، اس کے لیے متعدد اصحاب نے ایک ایک سو

روپے کی رقم پیش کی تھی۔

اس کے بعد "شمع اور شاعر" اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں پڑھی گئی۔ "خضر راہ" شیرانوالہ دروازہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں اور "طلوعِ اسلام" بھی اسی جگہ پڑھی تھی۔ "جواب شکوہ" موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام میں سنائی تھی جو محض اسی غرض سے منعقد کیا گیا تھا اور وہ بھی پڑھنے سے پیشتر چھپوالی گئی تھی۔

بہرحال متروکہ نظموں کے بہت سے اشعار عام لوگوں کی زبانوں پر تھے اس لیے کہ وہ بڑے بڑے مجمعوں میں پڑھی گئی تھیں اور بانگِ درا کی اشاعت سے پیشتر کتابچوں کی شکل میں چھپ کر فروخت ہوتی رہی تھیں جو لوگ کلامِ اقبال کے شائق تھے وہ انھیں کتابچوں پر قناعت کے لیے مجبور تھے یا کسی کو مخزن کے مختلف نمبر یا جلدیں مل جاتی تھیں تو انھیں خرید لیتا تھا۔ کتابچوں میں سے "مرغوب الجنسی" کی چھاپی ہوئی نظمیں بہت مقبول ہوئیں اس لیے کہ "مرغوب رقم" کا خط بہت اچھا تھا اور نظموں میں کاغذ بہت عمدہ لگایا جاتا تھا۔ ان کتابچوں میں سے "نالۂ یتیم"، "فریادِ امت"، "تصویرِ درد"، "اکبری اقبال" وغیرہ بہت شائع ہوئیں۔ اقبال کی نظموں کے اتباع میں بعض دوسرے شعرا کی مشہور نظمیں بھی اسی انداز میں چھاپی گئیں مثلاً آغا حشر مرحوم کی نظمیں "شکریہ یورپ" اور "موجِ زمزم"۔ تلاش کی جائے تو شاید اب بھی بازار میں ان کے کچھ نسخے مل جائیں، خصوصاً پرانی کتابیں اور رسالے فروخت کرنے والوں کے پاس ضرور موجود ہوں گے۔ بعض نظمیں ایسی بھی تھیں جن کے متعلق خواص کو بھی شاید ہی علم ہو حالانکہ وہ بہت بڑے مجمعوں میں سنائی گئی تھیں مثلاً "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے" جو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے منعقدہ ۱۹۰۲ء میں پڑھی گئی تھی یا ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ جو ۱۹۰۱ء کے ایک ماتمی جلسے میں سنایا گیا تھا۔

اقبال نے ان نظموں کو اوّلاً اس وجہ سے اپنے مستند مجموعہ کلام میں شامل کرنا

پسند نہ فرمایا کہ جس زمانے میں "بانگِ درا" مرتب ہوئی شعر و سخن کے باب میں ان کا معیار بہت بلند ہو چکا تھا اور یہ نظمیں اس معیار پہ پوری نہیں اترتی تھیں۔ بندش اور اسلوب بیان کے سلسلے میں وہ بڑے ہی سخت تھے مثلاً ایک مرتبہ مولانا گرامی کا یہ شعر بہت پسند آیا؛

ماہ را بر فلک دو نیم کنند
فقر را ترکمانے ہم ہست

اس زمانے میں تحریک خلافت زوروں پہ تھی۔ بعض لوگ کہا کرتے تھے کہ قریشیت بھی خلافت کی ایک شرط ہے اور یہ شرط ترکوں میں مفقود ہے۔ اقبال نے مندرجہ بالا شعر سے نہایت عجیب نکتہ پیدا کر لیا۔ فرماتے ہیں:

سخنے راندہ ای کہ جز قرشی بر سرِ مسند نبیؐ نہ نشست
درس گیر از گرامی ہمہ درد کہ برید از خود و بہ او پیوست
رمزِ ترک و خلافت عربی گفت آں میگسار بزمِ الست
"ماہ را بر فلک دو نیم کند
فقر را ترکمانے ہم ہست"

یہ تضمین اس لیے "پیامِ مشرق" میں شامل نہ کی کہ فرماتے ہیں، اس کی بندش کچھ زیادہ پسند نہ آئی۔ جس بزرگ کی نگہ بلند ایسی پاکیزہ نکتہ نوازیوں کو صرف اس لیے ترک کر دیتی تھی کہ بندش زیادہ اچھی نہ تھی۔ اس نے اگر بہت سی لمبی نظموں کو اپنے مستند مجموعے میں شامل نہ کیا تو اس پر تعجب کی کون سی وجہ ہے؟

دوسرا ضروری عامل جو بہت سی نظموں کے ترک کا موجب بنا، یقیناً یہ تھا کہ اقبال صرف انھی نظموں کو محفوظ رکھنے کے خواہاں تھے جو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے کائنات انسانیت کے لیے مفید ہو سکتی تھیں، یعنی جو ان کے خاص پیغام، خاص تعلیم اور حقائق حیات کی حامل تھیں۔ جن کے ذریعے سے انسان اپنے حقیقی وظائف و مقاصد بہتر طریق پر

بجا لانے کے اہل بن سکتے تھے۔ جو نظمیں موضوع، فکر و خیال اور تربیت و ترکیب کے لحاظ سے اس میزان میں پوری نہیں اترتی تھیں، انھیں محفوظ رکھنے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ چنانچہ بیشتر نظمیں اور بیشتر اشعار صرف اس لیے خارج کر دیئے گئے کہ ان کا دامن بہ حیثیت مجموعی معنویت کے ان جواہر ریزوں سے خالی تھا، جن پر اقبالؔ کے نزدیک شعر و سخن کے محاسن کا حقیقی انحصار تھا۔

"تاہم یہ سوال "بانگِ درا" کی اشاعت کے وقت ہی سے اہل ذوق کی توجہ کا موضوع بنا رہا کہ آیا اقبالؔ کے ان جواہر ریزوں کو بالکل طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا جائے، جنھیں خود انھوں نے بندش یا معنویت کے اعتبار سے اپنے بلند معیار کے مطابق نہ سمجھا یا انھیں کسی نہ کسی شکل میں محفوظ کر دینا چاہیے تاکہ وہ بھی کلام اقبالؔ کے مستند مجموعوں کی طرح محفوظ ہو کر موجودہ و آیندہ نسلوں کی دسترس میں رہیں اور ضائع نہ ہونے پائیں؟ اقبالؔ اس دنیا سے رخصت ہو کر مالکِ حقیقی سے جا ملے تو اس سوال نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی، اس لیے کہ ان نظموں کی فراہمی کے وسائل ناپید نہیں ہوئے تھے مگر مزید کچھ مدت گزر جانے کے بعد ان کا جمع ہونا بھی نظر بہ ظاہر محال تھا۔

ایک گردہ کا نقطۂ نگاہ کسی تشریح یا استدلال کا محتاج نہ تھا، یعنی یہ کہ جن چیزوں کو خود اقبالؔ نے محفوظ رکھنا مناسب نہ سمجھا اور قلمزد کر دیا، انھیں کیوں محفوظ کیا جائے؟ کیا اس لیے کہ اقبالؔ کے خاص پیغام اور خاص تعلیم میں ایسی چیزوں کی آمیزش کر دی جائے، جو اس پیغام اور اس تعلیم کی حامل نہ تھیں؟ لیکن اس کا جواب مشکل نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ اقبالؔ بہ ہر حال انسان تھے یقیناً بہت بڑے اور غیر معمولی انسان، لیکن ان کی بڑائی انسان ہونے ہی کی حیثیت میں قابلِ صد احترام تھی۔ وہ ابتدا میں بھی بعض صلاحیتوں کی یگانگی کے باعث عام لوگوں سے بالا تھے، تاہم ان صلاحیتوں کے اُبھرنے، نمایاں ہونے اور درجۂ کمال تک پہنچنے میں وقت لگا۔ جو اعلیٰ مرتبہ انھیں آخری دور میں حاصل ہوا اور اب

حاصل ہے۔ وہ ابتدائی اور درمیانی دور میں ہرگز حاصل نہ تھا۔ ان کی حقیقی عظمت کا انحصار لاریب اسی کلام پر ہے، جسے انھوں نے خود پسند فرمایا اور حفاظت کے لائق سمجھا، لیکن ان کا بقیہ کلام ایسا نہیں کہ اسے بالکل نظرانداز کر دیا جائے، اس لیے کہ اس میں بھی بعض بڑی بلند پایہ چیزیں موجود ہیں۔ نیز جو درجہ اقبال کے لیے قدرت نے مقرر کر رکھا تھا وہ انھیں مل گیا۔ اب کوئی چیز ان کی تعلیم یا ان کی عظمت میں خلل انداز نہیں ہو سکتی، پھر ان چیزوں کو محفوظ کر دینے میں کیوں تامل کیا جائے جو بجائے خود بھی خاصی قابل قدر ہیں۔ ان چیزوں کو محفوظ کر دینے کے بدیہی فوائد سے غالباً کسی کو بھی اختلاف نہ ہو سکتا تھا مثلاً:

۱۔ نفسیات کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو یہ اندازہ کرنے کے لیے معقول و محکم بنیادیں مل جائیں گی کہ اقبال کے قلم و دماغ نے نشو و ارتقا کی منزلیں کس رفتار سے طے کیں؟ وہی دل اور وہی ذہن تھا، جس نے ۱۹۰۰ء میں "نالۂ یتیم" لکھی، وہی دل اور وہی ذہن تھا جس سے ۱۹۲۲ء میں "طلوع اسلام" نے تراوش کی۔ فکر و نظر کی وہی بدیع المثال کارگاہ تھی، جس میں "زبور عجم"، "جاوید نامہ" اور سب سے آخر میں "ارمغان حجاز" ڈھل کر نکلی، جو میرے ناچیز فہم و اندازہ کے مطابق آج حقیقی شاعری کا بہترین نمونہ ہے، لیکن ابتدائی نظم اور آخری نظم میں کم و بیش چھتیس سینتیس سال کا فصل ہے اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اس لمبی مدت میں اقبال کے فکر و نظر اور دل و دماغ ایک ہی سطح پر رہے، یعنی ان میں حرکت و بالیدگی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اگر ہم اس مدت میں نشو و ارتقا کے مختلف مدارج و مراحل تلاش کر سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اور جو کچھ مل سکے اسے بھی ان مواد میں شامل نہ کر لیا جائے، اگرچہ وہ ۱۹۰۰ء سے بھی پیشتر کا ہو؟ یوں ہمارے موازنے کے لیے زیادہ وسیع سامان پیش نظر آ جائے گا۔

۲۔ عام اہل علم و ذوق کو معلوم ہو سکے گا کہ اقبالؔ بھی مشق و نمو کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اعلیٰ درجے پر پہنچے، عام حیثیت سے تدریجاً ترقی کرنے اور پایہ بہ پایہ اوپر پہنچنے سے کسی بھی انسان کو مفر نہیں اگرچہ وہ کتنا ہی بڑا ہو۔ بے شک ترقی و عروج کی رفتار اور اونچے سے اونچے درجے پر رسائی کا معاملہ خداداد صلاحیتوں کے بعد ان سے صحیح انداز میں کام لینے پر موقوف ہے۔ ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض لوگ شعر گوئی میں عمر بھر ڈوبے رہے، ان کی مشق کا یہ حال تھا کہ بے تکلف کھڑے ہو جاتے تھے تو فی البدیہہ لمبی لمبی نظمیں کہہ جاتے تھے۔ ان کے اشعار دفاتر کی حیثیت میں ہمارے سامنے موجود ہیں، مگر شاید ہی کوئی مقام ایسا آئے، جہاں نظر اٹکے اور اس کا دامن کھنچے۔ بیشتر اشعار ایسے ملیں گے جن میں بیان یا فکر کی کوئی بھی خوبی نہ ہوگی۔ پھر ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کی صلاحیتیں بڑی نادر تھیں مگر وہ جس مشغلے کے لیے موزوں تھے اس کے بجائے کسی دوسرے دائرے میں مصروف عمل رہے۔ یہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہ تھا۔ اس وجہ سے نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جنھیں قدرت نے خاص جوہروں سے نوازا، پھر انھوں نے ان جوہروں سے پورا فائدہ اٹھایا یعنی انھیں زیادہ سے زیادہ نشو و نما دی اور وہ درجہ حاصل کر گئے جو سب کے لیے باعثِ رشک ہے۔

۳۔ اقبالؔ نے ابتدائی دور کی بعض لمبی نظمیں ہی حذف نہ کیں بلکہ جن نظموں یا غزلوں یا دوسری چیزوں کو انتخاب میں شامل کیا ان کے اشعار میں بھی جا بجا خاصی تبدیلیاں کر لیں۔ بعض شعر بالکل حذف کر دیے۔ بعض میں جزوی ترمیم مناسب نہ سمجھی۔ بعض کی ترتیب بدل دی۔ ان کے تمام شعر محفوظ ہو جائیں تو اہل علم و ذوق کو حذف و ترمیم یا تغیر ترتیب پیش نظر رکھ کر اقبالؔ کے معیار شعر اور پیمانۂ نقطۂ نگاہ کا صحیح اندازہ کرنے میں سہولت ہوگی۔ مطالعہ اقبالؔ کے سلسلے میں اس شے کو جو اہمیت

حاصل ہے، وہ کسی خاص تشریح کی محتاج نہیں۔ مثالیں میں آگے چل کر پیش کروں گا۔

ان بدیہی فوائد کے پیشِ نظر میرا خیال یہ تھا کہ جن نظموں، غزلوں یا اشعار کو حذف یا ترمیم کیا گیا، انھیں پہلی شکل میں محفوظ کر دینا ضروری ہے اس لیے کہ وہ مطالعۂ اقبال کا بڑا ہی گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ممکن ہے مندرجہ بالا نکات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مطالعہ کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہ ہو، اس لیے کہ زیادہ تر لوگ نہ باریکیوں اور دقیقہ سنجیوں میں جاتے ہیں اور نہ جانا پسند کرتے ہیں لیکن حقیقی مطالعہ تو وہی ہے اگرچہ اسے بہت تھوڑے افراد تک محدود سمجھا جائے اور اقبال کو سمجھنا ہے تو اس کی صورت اس کے سوا کیا ہے کہ ان باریکیوں، نزاکتوں، لطافتوں اور نکتہ نوازیوں کی تلاش میں وادیاں قطع کی جائیں۔

سب سے آخر میں یہ کہ یہ دورِ حاضر کی اس محبوب شخصیت کا کلام ہے جس سے بڑھ کر پُر خلوص اور بے غرض محبت و عقیدت کے جذبات عوام کے سینوں میں کسی کے لیے موجزن نہ ہوئے اور اسے یقیناً محفوظ ہو جانا چاہیے اس لیے کہ محبوب کی ہر شے طبعاً محبوب و دل پسند ہوتی ہے۔

غرض میں ابتدا ہی سے ان اصحاب کا ہم نوا اور ہم آہنگ تھا، جو اقبالؒ کے اس قلم زدہ کلام کی فراہمی اور تحفظ کو بھی حد درجہ ضروری سمجھتے تھے۔ اس کے وجود و دلائل کے باب میں جو کچھ اجمالاً اوپر پیش کیا جا چکا ہے، مجھے یقین ہے کہ نہ وہ کسی تفصیل و تشریح کا محتاج ہے اور نہ ان دلائل میں کسی اضافے کی ضرورت ہے۔ دنیا کی کون سی زبان ہے جس میں بے شمار لوگوں نے شعر نہیں کہے؟ ہزاروں ایسے شاعر گزرے ہیں جن کے مستند و منتخب کلام میں سے بھی بہت کم اشعار ملیں گے، جنھیں واقعی شعر کہا جا سکے لیکن چند شاعر ایسے بھی گزرے ہیں جن کی ہر چیز سے اربابِ ذوق کے فکر و نظر کو خاص روشنی

ملتی ہے اور آرزو رہتی ہے کہ جو کچھ میسّر آیا ہے اس کے سوا بھی میسر آجائے تو اسے اپنی چشم بصیرت کا سرمہ بنائیں۔ اقبال بے شائبہ ریب ایسے ہی چند شعرا میں سے تھے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر اگر کہا جائے کہ صرف اُردو اور فارسی نہیں بلکہ دنیا کی کسی بھی زبان میں اس پائے کے شاعر بہت ہی کم ملیں گے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی قلمزدہ نظموں، غزلوں اور قطعات میں بھی ندرت فکر، جدت تخیل اور رفعت بیان کی سحر انگیزیاں اور معجز طرازیاں نہایت اعلیٰ پیمانے پر موجود تھیں اور اکثر مشہور شعرا کے مستند کلام میں بھی یہ محاسن شاید ہی اس کثرت سے مل سکیں، جس کثرت سے اقبال کے متروکہ کلام میں موجود ہیں۔ ان تمام خوبیوں سے بدرجہا زیادہ اہم وہ شے ہے جسے نظم کا خاکہ یا نقشہ کہنا چاہیے، یعنی جو موضوع پیش نظر ہے اسے زیادہ سے زیادہ بدیع، پُرتاثیر اور دلکش و دل آویز انداز میں پیش کرنے کا طریقہ۔ اقبال کے کلام کا یہ پہلو ایسا ہے کہ میرے علم اور اندازے کے مطابق اسے ابھارنے اور نمایاں کرنے پر اب تک پوری توجہ نہیں کی گئی، حالانکہ صرف یہی پہلو سامنے رکھ لیا جائے تو اقبال کی عظمت آفتاب جہاں تاب کی طرح درخشاں ہو جاتی ہے۔

میں نے "شکوہ" کے متعلق سرسری گفتگو کے سلسلے میں بھی اس پہلو کی طرف اشارے کیے تھے اور ان نظموں کا ذکر کرتے ہوئے اس پر زیادہ تفصیل سے بحث کروں گا، جو پیش نظر مجموعے میں شامل ہیں۔ یہاں بر سبیلِ توضیحِ مدعا چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اقبال کی ایک مختصر سی نظم ہے جس کا عنوان ہے "حضور رسالت مآبؐ میں"۔ یہ "بانگِ درا" کے حصّہ سوم میں شامل ہے۔ اس کا موضوع "شہدائے طرابلس" ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے اچانک طرابلس پر حملہ کر دیا۔ عربوں نے دورِ حاضر کے آلات و اسلحہ حرب سے محرومی اور یورپی تربیت عسکری سے ناآشنائی کے باوجود صرف غیرت و حمیت اسلامی کی بنا پر اس پُرجوش انداز میں مزاحمت کی کہ اٹلی کی فوجیں ساحلی حاشیے سے

آگے نہ بڑھ سکیں۔ بعض مجاہد ترک افسر بھیس بدل کر مصر کے راستے طرابلس پہنچے اور انھوں نے غیر منظم عربوں کو جا بجا چھوٹے چھوٹے دستوں میں منظم کر دیا۔ ان میں سے غازی انور پاشا کے کارناموں کو ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ صدر اوّل کے مجاہد مسلمانوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ طرابلس پر اٹلی کی اس یورش نے پاک و ہند ہی نہیں دنیا کے ہر حصّے میں مسلمانوں کے اندر ایک خاص جوشِ حمیّت تازہ کر دیا۔ جو چند واقعات عالمِ اسلام میں ہمہ گیر بیداری پیدا کرنے کے موجب بنے، ان میں سے ایک نہایت اہم واقعہ حملۂ طرابلس بھی تھا۔

اس واقعے پر ۱۹۱۱ء میں بہ طریق نظم و نثر بہت کچھ لکھا گیا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی طنزیہ نظمیں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ اقبالؔ نے اس پر بارہ شعر کی ایک نظم کہی، جس میں سے ایک شعر "بانگِ درا" کی ترتیب کے وقت حذف کر دیا گیا لیکن انھوں نے اپنے تاثرات جس انداز میں پیش کیے وہ پوری نظم کے خاکے سے واضح ہو سکتا ہے اور بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایسے واقعے کے لیے اس قسم کا بدیع اور نادر خاکہ شاید ہی کسی کے ذہن میں آیا ہو۔ فرماتے ہیں:

۱۔ زمانے کا ہنگامہ میرے لیے حد درجہ گراں ہو گیا تو میں نے رختِ سفر باندھا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہاں رہ کر شام و سحر کی قید میں زندگی تو گزاری مگر یہاں کے دیرینہ نظام سے شناسائی پیدا نہ کی۔ فرشتے مجھے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے اور آپ رحمت صلی اللہ علیہ وسلّم کے حضور میں پیش کر دیا۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے انتہائی لطف و نوازش سے خطاب فرمایا: اے باغِ حجاز کی بلبل! تیری نواؤں میں ایسی گرمی، اتنی حرارت اور اس درجہ سوز ہے کہ ہر دل کی کلی پگھل گئی ہے۔ تو چمن زارِ دہر سے یہاں آیا ہے بتا، ہمارے لیے کون سا تحفہ لایا ہے؟

۳۔ میں نے عرض کیا حضورؐ! دنیا میں اطمینان و آسودگی تو ناپید ہے۔ انسان جس

زندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے وہ تو میسّر نہیں آئی۔ اس باغ میں ہزاروں لالہ و گل موجود ہیں مگر ایک بھی کلی ایسی نہیں ملتی، جس میں وفا کی خوشبو موجود ہو۔ غرض ایسی کوئی چیز تو تھی نہیں جو حضورؐ کے لیے موزوں نذر بن سکتی، مگر میں ایک آبگینہ لے آیا ہوں۔ جو چیز اس میں ہے وہ جنت میں بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ اس میں اُمتِ حضورؐ کی آبرو جھلک رہی ہے یعنی اس آبگینے میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو بھرا ہے۔

اب آپ اشعار سے قطع نظر کرتے ہوئے اس خاکے پر غور فرمائیں۔ دنیا سے رخصت ہو کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضری، حضورؐ کا ارشاد کہ کوئی تحفہ ہمارے لیے بھی ہے؟ اس موقع پر پوری کائنات میں سے شہیدانِ طرابلس کے خون کو بہ انداز آبروئے ملّت پیش کرنا۔ دیکھیے خاکے نے اصل معاملے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ پھر اشعار کی خوبی و دل آویزی پر توجہ کیجیے:

۱۔ ایک مسلمان کے لیے کائنات میں اس سے بڑی آرزو کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا سے رخصت ہو کر دربارِ رسالتؐ میں حاضری کا شرف حاصل کرے؟

۲۔ ادب کا یہ مقام ملاحظہ فرمائیے کہ خود وہاں نہیں گئے بلکہ کہا: فرشتے لے گئے۔

۳۔ پھر ضمناً دنیا کی عام حالت بھی بیان کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ تحفے کا ذکر فرمایا تھا اس لیے حالت ایسے انداز میں بیان کی کہ تحفے کے لائق جو نمایاں چیزیں ہو سکتی تھیں انھی کی نفی کی، آخر میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو پیش کر دیا۔

شہیدان طرابلس مظلوم تھے ان پر بلاوجہ حملہ ہوا۔ بے سروسامانی کے باوجود انھوں نے بہ تقاضائے غیرت و حمیت فریضۂ جہاد کی بجاآوری کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے بے دریغ جانیں دینے لگے۔ دشمن کی قوت بہت زیادہ تھی اور یورپ کی

تمام طاقتیں اس دشمن کی پشتیبان تھیں، اس لیے کہ پہلے ہی سے خفیہ خفیہ عہد و پیمان کر چکی تھیں۔ دیکھیے نظم میں شہیدوں کی مظلومیت کو بخوبی واضح کر دیا مگر انداز ایسا اختیار کیا کہ مظلومیت تصریحاً مذکور نہیں ہوئی۔ تصریحاً صرف یہ مذکور ہے کہ امتوں کی آبرو اور قوموں کی عزت شہیدوں کا خون ہے اور حق یہ ہے کہ کسی قوم کی غیرت و حمیت کا عملی ثبوت اس کے سوا ہے بھی کیا؟ جو امت اور جو قوم راہِ حق و آزادی میں قربانیاں نہیں کر سکتی اپنے آپ کو اغیار و اجانب کی محکومی یا ظلم و باطل کی چیرہ دستی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی اسے عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنے کا کیا حق ہے؟ کون ہے جو اسے احترام کی نظروں سے دیکھے گا، خواہ اس کے اردگرد مادی دولت و ثروت کے کتنے ہی گراں قدر انبار موجود ہوں؟ قوموں کی زندگی کا اصل سرمایہ جذبۂ حریت ہے اور حریت کے لیے جانبازی پر آمادہ ہو جانے سے بڑھ کر کوئی خوبی اور اچھائی نہیں۔ اسی پہلو کو ابھارا تاکہ قوم شہادت زار طرابلس سے صحیح تاثر قبول کرے، ویسی ہی قربانیوں کے لیے تیار ہو جائے اور انھیں اپنے لیے باعثِ صد افتخار سمجھے۔

اقبال کی ایک نہایت نمایاں اور ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ حد درجہ درد انگیز اور غمناک قومی واقعات کو بھی ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان سے قوم کی روحِ عمل کے لیے سامانِ حرکت مہیا ہو اور اس کے راہوار عزت و ہمت کے لیے واقعات مہمیز بن جائیں۔ یہ نہ ہو کہ افسردگی، دل گرفتگی اور پژمردگی پیدا ہو، جو چمنستانِ حیات کے لیے بادِ زمہریر کا حکم رکھتی ہے کہ ادھر چلی اور ادھر شاخساروں کی قوتِ نمو منجمد ہو کر رہ گئی۔ پتے جھڑ گئے۔ پودوں کی تازگی و شادابی ختم ہو گئی۔ سرطرف بے رونقی چھا گئی یعنی قوم میں عمل کی روح اگر تھی بھی تو وہ مضمحل ہو کر رہ گئی۔

مولانا رومؒ نے فرمایا تھا:

خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ تر است
ایں گنہ از صد صواب اولیٰ تر است

معلوم ہے کہ خون کو پاک نہیں سمجھا جاتا اگر باوضو آدمی کے جسم سے خون نکل آئے اور اس طرح کہ منفذ سے نکل کر ذرا بھی پھیل جائے تو وضو باقی نہیں رہتا۔ لازم ہوگا کہ خون کو دھو کر وضو کی تجدید کی جائے۔ میت کو پانی سے غسل دے کر پاک کیا جاتا ہے مگر شہیدوں کو غسل نہیں دیا جاتا انھیں خون میں لتھڑے ہوئے ہی دفن کر دیتے ہیں اسی لیے فرمایا کہ شہیدوں کے لیے خون پانی سے بدرجہا افضل و اولیٰ ہے۔ دوسروں کے لیے یہ منافی پاکیزگی ہے لیکن شہیدوں کے لیے یہ پاکیزگی کا بہترین سرمایہ ہے۔ کم از کم پانی پر جو مادی پاکیزگی کا بہترین وسیلہ ہے، اسے ضرور ترجیح حاصل ہے۔ غالبؔ نے بھی شہادت ہی کا خون پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا تھا:

تو زیک قطرۂ خوں ترک وضو گیری و ما
سیلِ خوں از مژہ ریزیم وطہارت نہ رود

یہ صرف ایک مثال تھی کہ نظم کے خاکے کو کتنا اونچا درجہ حاصل ہے اور اقبالؔ کی اکثر نظموں میں رفعت و بلندی ہی نہیں بلکہ یگانگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ خاکہ بہت ہی اچھوتا تجویز فرماتے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً "غرۂ شوال" یا "ہلال عید" کو دیکھیے۔ ابتدا میں ہلال کو خطاب کیا ہے اور اس سلسلے میں ہلال کے ساتھ امت کے گہرے تعلق کی کیفیت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تو بلندی پر دور و سیر میں مصروف ہے۔ وہاں سے ہمارے گھر کی پستی بخوبی نظر آسکتی ہے۔ ذرا اس پر بھی ایک نظر ڈال لے۔ پھر مسلمانوں کی ایک ایک مصیبت، ایک ایک درماندگی، ایک ایک پریشاں حالی بیان کرتے جاتے ہیں۔ اس پس منظر نے ان حالات میں تاثیر و نفوذ کی قوت کو بجلی کی قوت سے بھی بدرجہا زیادہ بے پناہ بنا دیا ہے۔

"سسلی" والی نظم پر ایک نظر ڈالیے۔ ۱۹۰۸ء میں ولایت سے آرہے تھے جہاز بسینا کی بندرگاہ سے گزرا تو دائیں جانب سسلی کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ بائیں جانب

اٹلی کا ساحل تھا۔ سسلی کی روشنیاں دیکھتے ہی اس کی پرانی تاریخ کی یاد تازہ ہوگئی، جب مسلمان اس جزیرے پر حکمران تھے۔ شدت تاثر نے نظم کی صورت اختیار کی، لیکن دیکھیے، پہلے شعر میں دیدۂ خونبار کو رونے کی دعوت دے کر مسلسل چار شعروں میں مسلمانوں کے بنیادی اوصاف نہایت پُرتاثیر انداز میں پیش کیے، جو کشوروں اور اقلیموں، جزیروں اور سمندروں کو مسخر کرتے ہوئے وقت کی معروف دنیا میں پھر نکلے تھے۔

فرماتے ہیں:

"وہ صحرانشیں تھے مگر سمندر کے سینے پر ان کے سفینے کھیلتے پھرتے تھے یعنی خشک و تر ان کے لیے یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے بادشاہوں کے درباروں میں زلزلے ڈال دیے تھے۔ ان کی تلواروں میں بجلیوں نے اپنے آشیانے بنا لیے تھے وہ منظر عام پر نمودار ہوئے تو ایک نئے جہان، ایک نئی دنیا کی بنیاد ڈال دی۔ ان کی وہ تلوار جو صبر سے ناآشنا تھی، عہد کہن کو کھا کر ختم کر گئی۔ یہ جہان مر چکا تھا۔ ان کے لبوں سے "قم" کی آواز بلند ہوئی تو پھر جی اٹھا اور انسان کو اوہام کی زنجیروں سے رہائی مل گئی۔"

یہ زندگی کے ایسے حقائق ہیں جن سے مخالف و معاند بھی اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن واضح رہے کہ اقبالؔ کی زبان سے موجودہ و آیندہ اسلامی نسلوں کے لیے ایک حقانی دعوت بھی ہے جس میں سسلی کی پرانی یاد کے پس منظر نے ایک خاص تاثیر پیدا کر دی ہے۔

پھر اس سلسلے میں مختلف اسلامی مرکزوں کی تباہی کا ذکر آ گیا اور اقبالؔ نے ایک ایک کی تباہی کی یاد شاعروں کے مرثیوں سے تازہ کی یعنی بغداد برباد ہوا تو سعدیؔ نے اس کا مرثیہ کہا۔ دہلی پر ۱۸۵۷ء میں تباہی آئی تو داغؔ نے اس پر خون کے آنسو بہائے۔ دولت غرناطہ مٹی تو ابن بدروں کے دردمند دل سے فریاد کا طوفان اٹھا۔ بغداد، دہلی اور

غزناطہ پر ماتم و اشکباری ہو چکی۔ اے سسلی! تیری گزشتہ عظمت پر نوحہ خوانی کے لیے تقدیر نے میرا دل چن لیا، جو تیرا محرم تھا۔

بہر حال متروکہ نظموں، غزلوں اور شعروں کو محفوظ کر لینے کے دلائل بڑے قوی اور محکم تھے۔ علم و ادب کی یہ گراں قدر دولت اس وجہ سے بھی قابل حفاظت تھی کہ اس میں اقبالؔ کے کمالات فطری کی تابانی و درخشانی کے گوناگوں جلوے نمایاں تھے۔ اس وجہ سے بھی قابلِ حفاظت تھی کہ معلوم کیا جا سکتا تھا، اقبالؔ نے کیوں ان اشعار کو اپنے مستند کلام میں شامل نہ کیا؛ ان میں بیان یا فکر کے ایسے کون سے پہلو تھے، جن کی وجہ سے یہ اشعار اقبالؔ کی نگاہوں میں معیاری قرار نہ پائے؛ اس طرح شاعری کے متعلق مرحوم کے نقطۂ نگاہ کی بہتر توضیح کی جا سکتی ہے اور مثالوں سے اس توضیح کو پختہ و پایدار بنایا جا سکتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ خود اقبالؔ نے جن چیزوں کو قلم انداز کر دینا مناسب سمجھا، اس لیے کہ وہ ان کے نزدیک معیاری نہ تھیں تو ہم کیوں انھیں بالاہتمام بروے کار لائیں؛ کیا ہم غیر معیاری چیزیں محفوظ کر کے ان کی کوئی خدمت انجام دیں گے؛ یہ بات بادی النظر میں جتنی وزنی معلوم ہوتی ہے، دراصل اتنی وزنی نہیں۔ کیوں؛ اس لیے کہ:

۱۔ اقبالؔ کا مستند کلام زیادہ سے زیادہ شہرت پا چکا ہے۔ ان کی تصانیف معلوم و معروف ہیں۔ اب کوئی نئی چیز ان میں داخل نہیں ہو سکتی اور ایسا کوئی اندیشہ نہیں کہ ان کی ابتدائی چیزوں یا قلم انداز کیے ہوئے شعروں کو مرتب کیا جائے گا تو معاذ اللہ مرحوم کے لیے سبکی کا کوئی پہلو پیدا ہوگا۔

۲۔ اقبالؔ کے پیشِ نظر صرف ایک خاص تعلیم تھی، ایک خاص پیغام تھا۔ ہمارے پیشِ نظر دوسرے مقاصد بھی ہیں جو مطالعہ اقبالؔ کے اہم اجزا ہیں۔

۳۔ خود ان نظموں میں بھی اس مرحوم کی عظمت کے بعض ایسے پہلو موجود ہیں جو اکثر دوسرے شعرا کے مستند اشعار میں بھی بہت کم نظر آئیں گے مثلاً صرف اسی پہلو کو

دیکھیے کہ ایسے بلند پایہ اشعار محض اس لیے نظرانداز کر دیے کہ فکر و نظر کے اعتبار سے ان کے نزدیک معیاری نہ تھے یا جو پیغام ان کی زندگی کا نصب العین تھا اس سے ان اشعار کو زیادہ مناسبت نہ تھی۔

تاہم یہ سوال کم اہم نہ تھا کہ انھیں کس صورت میں محفوظ کیا جائے؛ آیا بعض مختلف رسائل و جرائد فراہم کر کے نظمیں نقل کرا دی جائیں اور ویسا ہی ایک نیا مرقع تیار کر دیا جائے جیسے مرقعے پہلے شائع ہو چکے تھے؛ یا پورے ذخیرے کو ایسے انداز میں مرتب کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ اہل ذوق کے لیے زیادہ سے زیادہ بصیرت افروز ہو اور اس کے مطالعے سے کلامِ اقبال پر غور و فکر کی نئی راہیں کھلیں؛

ظاہر ہے کہ ترتیب کا صحیح طریقہ پہلا نہ تھا دوسرا ہی تھا۔ یہ کام میرے عزیز دوست صادق علی صاحب دلاوری نے انجام دیا اور حقیقت یہ ہے کہ مجموعہ انھی کی سعی و کاوش کے باعث طباعت کے قابل ہوا۔ بلاشبہ بکھرے ہوئے کلام کی فراہمی بڑی محنت طلب تھی لیکن ان متفرق اجزا کو ایک خاص ترتیب سے جوڑ کر "کُل" بنانے کا سہرا دلاوری صاحب ہی کے سر ہے۔

علاوہ بریں مختلف نظموں کے آغاز میں ایسی عبارتیں لکھ دی گئی ہیں جن سے ان کی تاریخی حیثیت، پس منظر اور دوسرے ضروری نکات واضح ہو سکیں۔ جہاں جہاں تصریحات ضروری محسوس ہوئیں، اختصار سے حاشیے میں ان کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے تاکہ کتاب کے مطالعے میں قارئین کو سہولت رہے۔

ایک حد درجہ ضروری کام یہ تھا کہ اقبال نے جو نظمیں حذف و ترمیم کے بعد اپنے مستند کلام میں شامل کیں، ان کے بارے میں کوئی ضروری چیز نظرانداز نہ ہوتی، یعنی یہ کہ کن کن اشعار میں تبدیلیاں کیں؛ کیا کیا تبدیلیاں کیں؛ کن کن اشعار کی ترتیب بدلی؛ کن کن کو حذف کیا؛ یہ اشعار ایسے انداز میں پیش ہونے چاہئیں تھے کہ پڑھنے والے ذرا غور

کرتے ہی حقیقت حال سے آگاہ ہو جاتے۔ یہ کام بھی میرے عزیز دوست ہی نے انجام دیا۔

اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ فرمالیجیے:

۱۔ نظم ہمالہ کا ایک بند ابتدا میں یوں تھا:

نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی — آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی — ناز کرتی ہے فراز راہ سے جاتی ہوئی

"بانگِ درا" میں اس بند کو یہ شکل دی گئی ہے:

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی

شعر کا معمولی سا بھی ذوق رکھنے والے شخص پر یہ ایک نظر واضح ہو جائے گا کہ اس جزوی ترمیم نے بند کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

شاعر ہمالہ پہاڑ کے مختلف مناظر کی تصویریں کھینچ رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ندی کا منظر بھی پیش کیا اور معلوم ہے کہ ندی پہاڑ کا ایک عام منظر ہے۔ بلند چوٹیوں سے چشموں یا برف کا پانی بہ بہ کر نشیب میں جمع ہوتا ہے اور آب رواں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے شاعر بادل اور ہوا کے نقشے پیش کر چکا ہے پھر کہتا ہے ندی کو دیکھو یہ کتنی پاکیزہ، مصفّٰی اور خوش منظر ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کوثر و تسنیم کی موجیں بھی اس کے حسن و خوبی کو دیکھ کر عرق عرق ہو رہی ہیں۔ پھر اس پانی میں قدرت کی ہر شے منعکس ہے۔ سورج، چاند اور تارے، بلند پہاڑوں کی چوٹیاں، چیڑ اور دیودار کی قطاریں، رنگ بہ رنگ پھول، سب کی تصویریں اس میں نظر آتی ہیں گویا یہ ندی نہیں ایک طلسمی آئنہ ہے جو شاہد قدرت کو دکھایا جا رہا ہے پھر اس کی روانی کے انداز کا اندازہ کرو چونکہ اس کے پانی میں دریا کا سا زور نہیں بلکہ یہ ابھی جاری ہوئی ہے اس لیے پتھر راستے میں آجاتے ہیں تو کبھی ان سے پہلو بچاتی ہوئی نکل جاتی ہے اور کبھی جی میں آتا ہے تو کسی سے ٹکرا بھی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی منظر کشی شاعری میں معجز نمائی سے کم نہیں کہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے حد درجہ سادہ، طبعی اور وقوعی ہے، ساتھ ہی حد درجہ دل کش اور دل آویز بھی ہے۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دوں ندی والا مصرع "فلسفہ نظم" میں بھی آیا ہے جہاں زندگی کے تسلسل کو ایک مثال میں نمایاں کیا ہے۔ کہتے ہیں:

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی — آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئنہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور — گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی — مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

یعنی جہاں ندی اوپر سے چٹان پر گری، اس کی روانی اور تسلسل کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ ندی کی جگہ مضطرب بوندوں کی ایک دنیا نمایاں ہو گئی لیکن دو قدم آگے کی طرف نظر اٹھائیے۔ معلوم ہو گا کہ وہ تمام بوندیں مل کر پھر چاندی کے تار کی طرح ندی کی شکل اختیار کر گئیں۔ بالکل اسی مثال کا اطلاق زندگی پر ہوتا ہے۔ یہ ندی کی طرح چلی آ رہی ہے۔ یکایک موت سے سابقہ پڑ جاتا ہے گویا زندگی کی ندی کا آئینہ بھی چٹان پر گر کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے مگر پھر وہ سب منتشر اور بکھرے ہوئے قطرے مل کر ندی بن جاتے ہیں گویا موت درمیان کی ایک عارضی حالت و کیفیت ہے۔ اس سے زندگی کی جوئے رواں کے عام بہاؤ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ "گل رنگیں" پر ایک نظر ڈالیے۔ اس کا پہلا بند ابتدا میں یوں تھا:

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں — واقفِ افسردگی ہائے طپیدن دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں — کیوں یہ تسکینِ خموشی زا مجھے حاصل نہیں

سوز باتوں میں بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

دیکھیے، کتنے پاکیزہ تاثرات تھے۔ پھول سے کہتے ہیں: تو عقدۂ مشکل کو کھولنے کی زحمت سے آشنا نہیں۔ تجھے یہ معلوم نہیں کہ دل تڑپتا ہے تو اس پر کس طرح افسردگیاں چھا جاتی ہیں۔ تو محفل ہیں تو موجود ہے اور اس کے لیے باعثِ زینت ہے لیکن اس کی شورش میں شریک نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنی ذات میں بہ ہمہ وجود مطمئن ہے اور تیرا اطمینان اس درجہ ترقی کر چکا ہے کہ اس نے تجھ پر خاموشی طاری کر دی ہے۔ تیری پتیوں کی وضع قطع زبانوں کی سی ہے۔ اگرچہ قدرت نے تجھے سو زبانیں بخش دی ہیں مگر کوئی بھی لذّت گویائی سے بہرہ مند نہیں۔ سب پر سکوت طاری ہے۔ کیوں؟ میں سمجھتا ہوں اس لیے کہ تیرے سینے میں کوئی بھید چھپا ہوا ہے، جسے تو چھپائے رکھنا چاہتا ہے۔ بولتا اس لیے نہیں کہ ممکن ہے زبان کشائی کے ساتھ ہی وہ بھید لب پر آجائے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا بھید ہے جسے چھپانے کا اس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ سو زبانیں ہونے پر بھی خاموشی ہی کو ترجیح دی گئی ہے؟

مگر بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مصرعوں کی بندشیں پسند نہ تھیں، اس لیے انھیں بدل دیا۔ اب یہ بند یوں ہو گیا:

تو شناسا سے خراش عقدۂ مشکل نہیں — اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں — یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اب بند اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بدرجہا بلند تر ہو گیا۔ عقدۂ مشکل کی خراش سے وہی شناسا ہوتا ہے جس کے پہلو میں "دل" ہو۔ پھر انسان اور گلِ رنگیں کے درمیان کتنا بڑا فرق واضح کر دیا۔ یعنی پھول محفل کی زینت بنا رہتا ہے اور اس کی شورش میں شریک نہیں ہوتا لیکن انسان کو بزمِ ہستی میں رہ کر یہ

فراغت نصیب نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ صاحبِ "دل" ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک سوز و ساز آرزو ہے مگر پھول کی زندگی آرزو کے گداز سے سراسر بے بہرہ ہے۔

"ابر کوہسار" میں سے جو بند حذف کر دیے گئے ان میں سے ایک یہ تھا:

کی ذرا دست درازی جو ہوا نے مجھ پر — چاکِ دامن سے دمکتے نظر آئے اختر
مجھ سے چلنے میں نہ ہوگا کوئی غافل بڑھ کر — گر پڑے ہیں مرے دامن کی گرہ کھل کے گہر

مضمون سراسر حقیقت پر مبنی تھا یعنی رات کا وقت ہو، بادل چھایا ہوا ہو۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو۔ اس وقت تیز ہوا چلنے لگے تو بادل جگہ جگہ سے پھٹ جاتا ہے اور روزنوں میں سے تارے دمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر ابر کہتا ہے کہ میں چلنے میں کتنا غافل ہوں؟ یکایک دامن کی گرہ کھل کر موتی گر پڑتے ہیں اور مجھے گرہ کے کھل جانے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ بھی بالکل ایک طبعی کیفیت ہے۔ بادل برستا ہے تو اس کا نقشہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے دامن میں جتنے موتی باندھ رکھے تھے، گرہ کھل جانے سے وہ سب کے سب زمین پر گر پڑے؛ مگر یہ بند بداہتہً اس لیے ترک کیا گیا کہ اسلوب بیان معیاری نہ تھا۔

"خفتگان خاک سے استفسار" میں بعض بڑے اچھے شعر تھے، جنھیں قلمزد کر دیا گیا مثلاً:

واں بھی آزارِ غریبی سے کبھی روتے ہیں کیا؟
اس ولایت میں بھی دل ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں کیا؟
یہ خوشامد اس ولایت کا بھی کیا دستور ہے؟
واں بھی کیا سنگِ ریا سے شیشۂ دل چور ہے؟
واں کی عزت بھی حکومت بھی حباب آسا ہے کیا؟
واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا؟
آہ! اس کشور میں تو جوہر کی عزت کچھ نہیں
واں کی نگری میں بھی اس موتی کی قیمت کچھ نہیں؟

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں شاعر نے یہ سوالات اس لیے کیے کہ جواب مل جائے؟ حاشا وکلاّ، بلکہ وہ اپنے دور، اپنے عہد اور اپنے ماحول کے حالات و کوائف پیش کرنا چاہتا ہے، جو "خفتگانِ خاک سے استفسار" کے پس منظر میں حد درجہ پُر تاثیر بن گئے ہیں، یعنی شاعر کہنا صرف یہ چاہتا ہے کہ ہمارے ہاں تو غریبوں کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں، خوشامد پہ مدار ہے اور دل کا آئینہ ریاکاری کے پتھر سے ریزہ ریزہ ہے۔ عزت یا حکومت کی حیثیت بلبلے کی مانند ہے۔ یہاں صرف دولت اور ثروت کو شرافت کا پیمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سیرت و کردار پر کسی کی نظر نہیں۔ کسی میں جوہرِ قابل ہو تو یہاں کوئی اس کا احترام نہیں کرتا۔ کیا خفتگانِ خاک کی دنیا کا بھی یہی حال ہے؟

"سرسید کی لوحِ تربت" میں سے جو شعر چھوڑے گئے ان کی حیثیت بھی یہی تھی یعنی بہ ظاہر مقصود نصیحت تھی، مگر حقیقت میں جو کچھ اقبال کے گرد و پیش ہو رہا تھا اس کی تصویر کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

دیکھ، اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بیگانگی
چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی
دین کے پردے میں تو دنیا کا سودائی نہ ہو
آڑ میں مذہب کی شوقِ عزت افزائی نہ ہو
گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں
یہ تعصب کوئی مفتاحِ درِ جنت نہیں
راہبر کو قافلے کے ساتھ رہنا چاہیے
کیا چلے گا کارواں جب رہنما پیچھے رہے
ہو شرابِ حبِ قومی سے اگر سرشار تو
ہو نہ اپنی عزت افزائی کی تجھ کو آرزو

اب ایک دو لمبی نظموں کے متعلق چند گزارشات ملاحظہ فرمالیجیے:

"نالۂ یتیم" سب سے پہلی نظم تھی جو اقبالؔ نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی اور اسی سے ان کی ہمہ گیر شہرت کا آغاز ہوا۔ میں اس کے اشعار یا اسلوب بیان پر بحث نہیں کروں گا لیکن اس کے نقشے پر ایک نظر ڈالیے۔ اس سے پہلے بھی یتیموں کے متعلق بہت سی نظمیں لکھی گئی ہوں گی اور انجمن حمایت اسلام کی ابتدا چونکہ یتیم خانے کی بنیاد سے ہوئی تھی، اس لیے یہ موضوع اس کے سالانہ جلسوں میں شاعروں، واعظوں اور خطیبوں کے لیے بہ طور خاص مستحق توجہ ہوگا، لیکن اقبالؔ کی نظم کے نقشے کو سرسری نظر سے ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اس نقشے ہی نے نظم کو حد درجہ اثر انگیز اور قیامت خیز بنا دیا۔

ابتدا کے چند بندوں میں درد و غم کی عام کیفیت کا اظہار ہے پھر یتیم کی زبان سے "ظل دامان پدر" کا ذکر فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

سایۂ رحمت ہے تو اے ظلِ دامانِ پدر — غنچۂ طفلی پہ ہے مثل صبا تیرا گزر
رہنما ہے وادیٔ عالم میں تو مثل خضر — تُو تو ہے اک مظہر شانِ کریمی سر بسر
ہے شہنشاہی جو طفلی، تو ہُما تاثیر ہے
تُو نہ ہو تو زندگی اک قید بے زنجیر ہے

یتیم کو اپنی بے کسی یاد آتی ہے۔ ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی شے سہارے اور رفاقت سے محروم نہیں، صرف یتیم ہر سہارے سے محروم ہے:

جوششِ صرصر سے ہے اے بحر جولانی تری — اور قمر کے دم سے ہے ساری یہ طغیانی تری
کوہ و دریا میں ہے قایم شان سلطانی تری — اور شعاعِ مہر سے ہے خندہ پیشانی تری
نظمِ عالم میں نہیں موجود ساز بیکسی
ہو گئی پھر کیوں یتیمی صیدِ بازِ بیکسی؟

اسی طرح روتے دھوتے یتیم کو وہ مقدس آستانہ یاد آتا ہے جو کائنات انسانیت کی پناہ گاہ ہے اور جس کی آغوشِ رحمت میں پہنچنا ہر انسان کے لیے سعادتِ دارین کی دستاویز ہے۔ دیکھیے، یتیم کس انداز سے اس آستانے پر پہنچ کر اپنی کیفیت بیان کرتا ہے:

اے مددگارِ غریباں، اے پناہِ بے کساں — اے نصیرِ عاجزاں، اے مایۂ بے مایگاں
کارواں صبر و تحمل کا ہوا دل سے رواں — کہنے آیا ہوں میں اپنے دردِ غم کی داستاں

ہے تری ذات مبارک حلِ مشکل کے لیے
نام ہے تیرا شفا دکھے ہوئے دل کے لیے

یتیم اپنا درد بھی کہتا جاتا ہے، ساتھ ساتھ نئے انداز کی نعت بھی اس کی زبان پر جاری ہے۔ نعت کے مضامین ملاحظہ ہوں:

دل ربائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تو — مثلِ آوازِ پدر شیریں تر از کوثر ہے تو
جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو وہ گوہر ہے تو — از پئے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تو

زیبِ حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تو ہوا
تھی مؤخر سب سے آمد، پر مقدم تو ہوا

اس کے بعد حضور رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم اس فریاد کو سن کر ارشاد فرماتے ہیں:

میری امت کیا شریکِ دردِ پیغمبر نہیں؟
کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشر نہیں؟

ہے اور ضرور ہے۔

جس طرح مجھ سے نبوت میں کوئی بڑھ کر نہیں — میری امت سے محبت میں کوئی بڑھ کر نہیں
امتحانِ صدق و ہمت میں کوئی بڑھ کر نہیں — ان مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں

یہ دل و جاں سے خدا کے نام پر قربان ہیں
ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وہ انسان ہیں

دیکھیے، یہ بالکل ابتدائی نظم ہے، لیکن اقبال کو خدا نے جو دل و دماغ عطا کیا تھا، وہ ابتدا میں بھی فکر و نظر کے اعتبار سے یگانہ تھا۔ کوئی اور ہوتا تو خدا جانے یہاں پہنچ کر کیا رنگ اختیار کرتا مگر اقبال ہمیشہ مسلمانوں کے محاسن ہی نمایاں کرتے رہے۔ اسی ذریعے سے ان میں عمل کی تحریک فرماتے اور انھیں سرگرمی کار کی دعوت دیتے رہے۔ انھیں حمیت امتحان صدق و ہمت اور غیرت میں سب سے بڑھ کر قرار دیا۔ فرمایا کہ وہ خدا کے نام پر دل و جان سے فدا ہیں اور ایسے انسان ہیں کہ فرشتے بھی ان پر فدا ہوں۔

اب ایک اور نظم پیشِ نظر لائیے جس کا موضوع اس سے بالکل مختلف تھا یعنی "ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ"۔ یہ بھی ابتدائی دور کی نظم ہے۔ اقبال نے متعدد مرثیے کہے اور قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ کوئی ایک بھی دوسرے سے نہیں ملتا۔ ہر مرثیے کا رنگ اور انداز دوسرے سے الگ ہے۔ میرے علم کے مطابق سب سے پہلا مرثیہ وہی ہے جو ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر کہا گیا اور ایک جلسہ عام میں پڑھا گیا۔ اس کے بعد:

۱۔ دوسرا مرثیہ داغ کا تھا جو ۱۹۰۵ء میں کہا گیا۔

۲۔ تیسرا مرثیہ "گورستانِ شاہی" ہے۔ یہ ۱۹۱۰ء کا ہے۔

۳۔ چوتھا مرثیہ "فلسفۂ غم" ہے جو غالباً ۱۹۱۲ء کا ہے۔

۴۔ پانچواں مرثیہ ہے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جسے میرے نزدیک دنیا بھر کی رثائی نظموں میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔

۵۔ چھٹا اور سب سے آخری مرثیہ راس مسعود مرحوم کا ہے۔

ملکہ وکٹوریہ والے مرثیے پر ایک مفصّل نوٹ میں لکھ چکا ہوں یہاں اس کے مطالب کا اعادہ غیر مناسب ہوگا۔ خاص طور پر قابلِ غور نظم کا چوتھا بند ہے جس میں موضوع سے قطع نظر کرتے ہوئے حکمرانی کا مثالی نقشہ پیش کیا گیا ہے اور غالباً مرثیہ کا اصل محرک یہی امر تھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ مثالی حکمرانی کے خصائص کیا بیان فرماتے ہیں:

۱۔ حکمرانی یہ ہے کہ دوسروں کے غم سے آنکھیں نم آلود ہوں۔

۲۔ حکمرانی یہ ہے کہ حکمرانی کی شان نظر میں رہے۔

۳۔ حکمرانی یہ ہے کہ ہر فرد کے درد سے جگر تڑپ اٹھے۔

۴۔ حکمرانی یہ ہے کہ دوسروں کی خوشی سے دل خوش اور دوسروں کے رنج سے دل رنجیدہ ہو۔

۵۔ حکمرانی یہ ہے کہ دوسروں کی بے تابیوں اور دوسروں کے درد کو اپنا لیا جائے۔

۶۔ حکمرانی یہ ہے کہ تخت پر بیٹھ کر بھی دوسروں کا خیال ہر وقت رکھا جائے اور تلوار کا وار کسی پر بھی ہو مگر حکمران کی ڈھال ہر وار کو روکے۔

۷۔ حکمرانی یہ ہے کہ دل محبت کی شراب سے لبریز ہو اور یہ محبت نگاہوں میں نمایاں ہو۔

۸۔ حکمرانی یہ ہے کہ جو بات زبان پر آئے وہ پاکیزہ، صاف اور بے لاگ ہو، حکمران کا دل دردمند وہی فیصلے کرے جو از روے حق و انصاف ہونے چاہئیں۔

۹۔ حکمرانی یہ ہے کہ دشمن بھی امان مانگے تو حکمران کی آنکھوں میں مروّت امنڈ آئے۔

۱۰۔ حکمرانی یہ ہے کہ جس طرح نگاہوں میں نور ہوتا ہے اسی طرح حکمرانوں کا فرمان دلوں کی ولایت میں رواں رہے۔

مقابلہ مقصود نہیں، صرف بر سبیلِ تذکرہ کہنا چاہتا ہوں کہ عین اسی موقع پر خواجہ حالی مرحوم نے بھی ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ کہا تھا اور وُہ جنوری ۱۹۰۱ء کے "معارف" میں شائع ہوا تھا۔ وہ بھی بڑا اچھا مرثیہ ہے۔ اس کا آغاز ہی یُوں ہوتا ہے کہ کوئی شخص بادشاہ ہو یا فقیر، حاکم ہو یا محکوم، جس کی نیکیاں دنیا میں زندہ ہوں وہ مرتا نہیں۔ جو لوگ زندگی "مرنجان مرنج" طریقے پر بسر کرتے ہیں، غیر انھیں اپنا سمجھتے ہیں اور دشمن مہربان جانتے ہیں، وُہ دنیا سے اٹھتے ہیں یعنی اس فانی زندگی سے کنارہ کش ہوتے ہیں تو ان کی خوبیوں اور نیکیوں کی داستانیں ایک ایک زبان پر جاری رہتی ہیں:

ان کا جینا کیسی نعمت ہو گی دنیا کے لیے
جن کا مرنا ان کے حق میں ہے حیاتِ جاوداں

گویا خواجہ حالی مرحوم و مغفور کے پورے مرثیے میں بنیادی مضمون وہی ہے جو خواجہ شیراز نے مختصر الفاظ میں یُوں پیش کر دیا تھا:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

خواجہ حالی نے اسے محاسن و مکارم کی تفصیل سے زیادہ موثر بنا دیا۔ یہ مرثیہ بھی خواجہ صاحبؒ کی عام نظموں کی طرح سادہ اور سراپا ناصحانہ ہے۔ اس میں وکٹوریہ کی نیکیاں اور خوبیاں جا بجا بیان کی گئی ہیں مگر حکمرانی کا کوئی مفصل مرقع اس طرح یکجا نہیں ملتا، جسے نظم یا مرثیے کی بنیاد و اساس قرار دیا جا سکے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہاں تقابل منظور نہیں اور تقابل کی نہ ضرورت ہے اور نہ یہ اس کا موقع اور محل ہے۔ حالی اور اقبال کی عمروں میں تفاوت کی وسیع خلیج حائل تھی۔ خواجہ حالی زندگی کا بڑا حصہ گزار چکے تھے اور چودہ سال بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اقبال نے ابھی خدمتِ عالم کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ عوام سے صرف ابتدائی شناسائی حاصل کی تھی اور اڑتیس سال باقی تھے، جن میں انھیں رفعت و سربلندی کی نئی چوٹیوں پر پہنچنا تھا۔ پھر خواجہ حالی اور اقبال کے دو اڑ فکر و نظر بھی بالکل الگ تھے لہٰذا تقابل کا پایہ سخن درمیان آ ہی نہیں سکتا۔ صرف یہ عرض کرنا تھا کہ جس اقبال نے آگے چل کر اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور اس طرح کائنات انسانیت کی بے مثال خدمت کے راستے ہموار کیے، وہ اپنے ابتدائی دور میں بھی عام اسلوب فکر اور عام افتادِ طبع کے اعتبار سے بالکل جداگانہ حیثیت کے حامل تھے۔ ممکن ہے لوگوں کو اس وقت احساس تک نہ ہو کہ جس اقبال کی نظمیں شوق سے سنی جا رہی ہیں وہ آگے چل کر

عظمت کی کن بلندیوں پر پہنچنے والا ہے یا وہ ان افراد جلیل وعظیم میں سے ہے، جن کا ظہور صدیوں کے بعد ہوتا ہے۔ ممکن ہے خود اقبال کو بھی اپنی یگانہ صلاحیتوں کا اس وقت کوئی اندازہ نہ ہو مگر ہمارے سامنے آج اس نادر الوجود زندگی کے مختلف ادوار کی داستانیں کھلی پڑی ہیں اور بے تکلف کہہ سکتے ہیں کہ اس ابتدائی دور میں بھی اقبال کے فطری جوہروں کی درخشانی سب سے الگ تھی اگرچہ منزل بلوغ پر پہنچ کر ان جوہروں نے جو جلوہ زار پیدا کیا وہ ابتدائی دور کی تجلیوں سے اتنا ہی مختلف تھا جتنا ماہ کامل ماہ نو سے مختلف ہوتا ہے گو دونوں اصلاً ایک ہی شے ہیں۔ ابتدائی جبیں نمائی کو ہم ہلال سے تعبیر کرتے ہیں اور جب پورا چہرہ بے نقاب ہو کر جگمگاتا ہے تو اسے بدر کا نام دے دیتے ہیں:

عبارا تنا شتّٰی و حسنک واحد

و کل الیٰ ذاک الجمال یشیر

یہ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء کی نظمیں تھیں۔ وکٹوریہ کے مرثیے سے غالباً صرف ایک مہینا بعد اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اپنی دوسری نظم پڑھی جس کا عنوان تھا "یتیم کا خطاب ہلال عید سے"۔ میں اس پر یہاں تفصیلی بحث نہیں کروں گا لیکن اتنا ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ چھوٹی بحر میں حسن فکر اور اعجاز بیان کے عجیب کمالات اس نظم میں دکھائے گئے ہیں۔ "ہلال عید" کے لیے بے شمار تشبیہیں نظم کی ہیں جن میں سے اکثر نئی ہیں اور لطف یہ کہ ابتدا میں تمام تشبیہیں عام نقطۂ نگاہ سے پیش کی گئیں پھر یتیم نے ہلالِ عید کو دیکھا اور اپنا رنج وغم یاد آیا تو اس نے اپنے نقطۂ نگاہ سے "ہلال" کی تعبیر شروع کر دی مثلاً یہ کہ اے ہلال! تجھے ہلالِ عید کہنا ہرگز صحیح نہیں تو رنج وغم کی شراب کا ساغر ہے۔ اس لیے کہ تجھے دیکھتے ہی بیکسی اور غربت کا ماتم تازہ ہو جاتا ہے۔ تیری صورت گفتگو کرنے والے لب سے مشابہ ہے۔ بہتر ہے کہ مجھ ایسے ستم نصیبوں کی کہانی سنا دے پھر یتیم ہلال کو طعنے دیتا ہے۔ کہتا ہے تو کیا ہے؟ ایک کاسۂ سوال بن کر آ گیا ہے

تاکہ سورج سے روشنی کی بھیک مانگے۔ تیری آنکھ ہر وقت چشمۂ خورشید پر لگی رہتی ہے ادھر سے تجلی ملتی ہے تو تیرے وجود میں چمک دمک پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو کمال کی شراب کا پیاسا ہے۔ عید کا پیغام لے کر آیا ہے اور جن بچوں کے سر پہ والدین کا سایہ موجود ہے، وہ نئے لباس بنوا رہے ہیں تاکہ عید کے موقع پر پہنیں اور خوشیاں منائیں مگر یتیم کے دل میں نئے لباس اور نئی پوشاک کا جو شوق ہے وہ تو پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یتیم بے وسیلہ ہے؟ اس کا باپ زندہ نہیں جو کما کر لائے اور اس کا شوق پورا کرے، لہٰذا اس کے لیے تو شرمندگی اور انفعال کا سبق بن گیا ہے۔ اس بند کا آخری شعر حد درجہ سادہ اور بے تکلف ہے مگر دیکھیے کس درجہ پُر تاثیر ہے؛

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہوں میں؟
تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں؟

"تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں" میں وہ سب کچھ کہہ دیا جس کی تفصیل دفتروں میں بیان کی جا سکتی ہے۔

پھر مختلف بندوں کے بعض منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے:

درد کو زندگی سمجھتے ہیں — جاوداں ہو یہ زندگی نہ کہیں
ہوں وہ بیکس کہ ڈرتا رہتا ہوں — چھوڑ دے مجھ کو بیکسی نہ کہیں
گاہے ماہے ہلال آتا ہے — ہو لبِ نانِ مفلسی نہ کہیں

ماہ کے بھیس میں نمایاں ہو
اپنی تقدیر کی کجی نہ کہیں

سیر میں اب نہ دل لگائیں گے — کس کی انگلی پکڑ کے جائیں گے
صبح جانا کسی کا وہ گھر سے — اور وہ رونا کہ ہم بھی جائیں گے
کھیل میں آ گئی جو چوٹ کبھی — کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں گے

کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے　　ساتھ مکتب میں لے لے جائیں گے؟
سننے والے گزر گئے اے دل　　اپنے شکوے کسے سنائیں گے

عید آئی ہے، اے لباسِ کہن
اب ترے چاک پھر سلائیں گے

اک بہانہ ہلال عید کا ہے　　قوم کو حالِ دل سناتے ہیں
ہاں بتا دے فلک کہ طفلی میں　　درد کو کس طرح چھپاتے ہیں
وہ بھی ہوتے ہیں اے خدا کوئی　　جو مصیبت کو بھول جاتے ہیں

ہم نہ بولیں تو خامشی کہہ دے
یہ قیامت کے دُکھ اٹھاتے ہیں

ان اشعار کو توجہ سے ملاحظہ فرمائیے۔ "یتیم" کی بیکسی کا یہ منظر کتنا درد انگیز ہے کہ اسے اندیشہ لگا ہوا ہے کہیں بیکسی بھی ساتھ نہ چھوڑ دے۔ ہلال مہینے میں ایک مرتبہ نکلتا ہے، یتیم کہتا ہے یہ بھی شاید روٹی کا ایک کنارہ ہے جو غریبوں اور مفلسوں کو ملتا ہے اور ہلال کی طرح وہ بھی صرف گاہے ماہے۔ دوسرے بند میں وہی باتیں پیش کی ہیں جن کا تعلق بچّوں کے ماحول سے ہے یعنی جن بچّوں کے والد زندہ ہوں وہ والد کی انگلی پکڑ کر سیر کو جاتے ہیں والد کہیں جانے لگے تو بچّہ روئے گا مجھے بھی ساتھ لے جائیے۔ کھیلتے کھیلتے کہیں چوٹ لگے گی تو والد سے چھپائے گا کہ دیکھ کر خفا نہ ہوں اور کبھی مدرسے سے غیر حاضر ہو جائے گا تو عموماً والد کو ساتھ لے کر جائے گا کہ استاد کی سزا یا پرسش سے محفوظ رہے۔

۱۹۰۲ء میں انجمن کا جو سالانہ اجلاس ہوا، اس کے لیے اقبالؔ نے اسلامیہ کالج کو مرکزِ فکر بنایا اور اس پر نظم لکھی چنانچہ اس کا عنوان تھا "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے" دیکھیے اس زمانے میں بھی اقبالؔ کے خیالات تعلیم کے اس عظیم المشان سرچشمے کے متعلق

کتنے بلند تھے۔ فرماتے ہیں اور اسلامیہ کالج کی زبان سے فرماتے ہیں:

طوسی و رازی و سینا و غزالی و نصیر — آہ وہ دلکش مرقع پھر دکھا سکتا ہوں میں
آئیں اُڑ اُڑ کر پتنگے روم و مصر و شام سے — شمع اک پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں
آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو — ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دکھا سکتا ہوں میں
گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے — وہ صدا پھر اس زمانے میں سنا سکتا ہوں میں

ناز تھا جس پہ کبھی غرناطہ و بغداد کو
پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں

بلاشبہ آگے چل کر اقبال کے فکر و نظر میں بڑی رفعت اور بڑی بلندی پیدا ہوگئی۔ اس کے معیار بہت اونچے ہوگئے مگر ۱۹۰۲ء میں بھی جب ان کی معجز نمائی کا ابتدائی دور تھا وہ یہی امید لیے بیٹھے تھے کہ جس اسلامی درسگاہ کا انتظام پنجاب میں ہوا ہے وہ دور گزشتہ کے سے اکابر پیدا کرے گی۔ اس شمع پر بابر کے ملکوں سے پروانے اڑ اڑ کر آنے لگیں گے۔ تعلیم کے اعجاز سے کام لیا جائے گا تو وہ منظر پھر پیدا ہو جائے گا جسے آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ مسلمانوں کے دور عروج و عظمت میں فرنگستان جس صدا کے لیے گوش بر آواز رہتا تھا، اسلامیہ کالج وہی صدا پھر زمانے کو سنا سکے گا اور غرناطہ و بغداد کو جس محفل علم و فضل پر ناز تھا اس کے دم سے وہ اس دنیا میں دوبارہ جم جائے گی۔

یہ اس دور کے عزائم اور آرزوئیں ہیں جب یہاں عام طور پر ایسی باتیں حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتی تھیں۔ ساتھ ساتھ دیکھتے جائیے کہ اقبال اس وقت بھی ہر مسلمان کو محنت و مشقت، سعی و کوشش اور جد و جہد کی تعلیم دیتے تھے جو زندگی کے آخری دور میں ان کا خاص پیغام بن گئی۔ وہ اس زمانے میں بھی مسلمانوں کو دنیا کے لیے وجہ زیب و زینت بنانے کے آرزومند تھے اور یہ شان جن اوصاف و خصائل سے پیدا ہو سکتی تھی وہ صرف صحیح اسلامی اوصاف و خصائل تھے۔ فرماتے ہیں:

جس نے پایا اپنی محنت سے زمانے میں فروغ
ہے وہی اخترِ جبینِ کہکشاں کے واسطے

زندگی وہ چاہیے، دنیا کی زینت جس سے ہو
شمعِ روشن بن کے رہ بزمِ جہاں کے واسطے

گلشنِ عالم میں وہ دلکش نظارہ ڈھونڈنا
آنکھ کو فرصت نہ ہو خوابِ گراں کے واسطے

یہ تو پوشیدہ ہے بے آرامیِ محنت میں کچھ
جا رہا ہے تو کہاں آرامِ جاں کے واسطے

پھر کہتے ہیں کہ ان مقاصد و عزائم کے لیے جد و جہد درکار ہے۔ محنت و مشقت درکار ہے۔ نصب العین کی طرف انسان کو قدم بڑھانا چاہیے اور اپنے اوپر ہر قسم کی سختیاں، ہر نوع کی تکلیفیں اور ہر رنگ کی جانفشانیاں بے تکلف گوارا کر لینی چاہئیں کیوں؟ اس لیے کہ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس کبھی نہیں آتا۔ قافلہ منزل کے لیے رختِ سفر باندھتا ہے، منزل نے قافلے کے لیے رختِ سفر کبھی نہیں باندھا:

تشنہ لب کے پاس جاتا ہے کبھی اٹھ کر کنواں؟
رخت کب منزل نے باندھا کارواں کے واسطے؟

اس نظم کے آٹھویں بند میں فرماتے ہیں:

بزم میں شوقِ مے، حکمت ہو اپیدا، مگر
مے کبھی بٹ جائے گی، پہلے فکرِ پیمانہ تو ہو

درس گاہ کی حیثیت یقیناً پیمانے کی ہے جس شخص کی آرزو ہو کہ حکمت کی شراب محفل میں تقسیم کرے، ظاہر ہے کہ اسے سب سے پہلے ساغر و پیمانہ کا انتظام کرنا چاہیے، اس لیے کہ شراب ساغر و پیمانہ کے بغیر تقسیم نہیں ہو سکتی اور اسے محفل کے ہر لذت دوست تک پہنچایا نہیں جا سکتا:

یہ نظامیہ سلامت ہے تو پھر سعدیؔ بہت
ہاں ذرا ویسا منوّر اپنا کاشانہ تو ہو

یادگارِ فاتحان ہند و اندلس ہو تمہیں شان شاہانہ نہ ہو میری امیرانہ تو ہو
وہ غنی ہے علم کی دولت بھی کرتا ہے عطا ہاں مگر پہلے روش تیری گدایانہ تو ہو
رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے
زندگی تیری جہاں میں دل ربایانہ تو ہو

آخری شعر کا جو بنیادی مضمون ہے، اسے اقبال کے درمیانی اور آخری دور میں بھی بنیادی حیثیت ہی حاصل رہی مثلاً "تصویر درد" میں کہتے ہیں جو ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی تھی :

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

اسے چھوڑیئے، ان کی آخری بڑی نظم "طلوع اسلام" کو دیکھیے :

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

محبت سے مقصود محبت داخلی بھی ہے اور محبت خارجی بھی ہے، یعنی یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان آپس میں محبت کے رشتوں سے بندھے ہوئے ہوں۔ ان کے درمیان خون، نسل، رنگ اور جغرافیائی تقسیمات کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ وہ فرقہ واری کی تمام کشمکشوں کو ختم کر کے اسلام کے بنیادی قانون محبت و اخوت کو دنیا بھر میں پھیلادیں۔ اس لیے فرمایا :

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

قرآن مجید کی تعلیم یہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

يَآيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد

وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔ (سورۂ حجرات)

اور ایک عورت سے اور رکھیں تمھاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ آپس میں پہچان ہو۔ تحقیق عزت اللہ کے یہاں اسی کو بڑی ہے جس کو ادب بڑا۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے، خبردار۔

یہ حضرت شیخ الہندؒ مرحوم کا ترجمہ ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم اس پر حاشیہ لکھتے ہیں:

"اکثر غیبت، طعن و تشنیع اور عیب جوئی کا منشا کبر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس کو بتلاتے ہیں کہ اصل میں انسان کا بڑا یا چھوٹا یا معزز و حقیر ہونا ذات پات اور خاندان و نسب سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ جو شخص جس قدر نیک خصلت، مودب اور پرہیزگار ہو، اسی قدر اللہ کے ہاں معزز و مکرم ہے۔ نسب کی حقیقت تو یہ ہے کہ سارے آدمی ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم و حوّا کی اولاد ہیں۔ شیخ، سید، مغل، پٹھان، صدیقی، فاروقی، عثمانی، انصاری سب کا سلسلہ آدم و حوّا پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ ذاتیں اور خاندان اللہ تعالیٰ نے محض تعارف اور شناخت کے لیے مقرر کیے ہیں ..... مجد و شرف اور فضیلت و عزّت کا اصلی معیار نسب نہیں تقویٰ اور طہارت ہے۔"

اسی مضمون کے ارشادات خود حضور رحمۃ للعٰلمین صلعم سے منقول ہیں۔ مثلاً فتح مکہ کے موقع پر فرمایا کہ کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، غربی کو شرقی پر اور شرقی کو غربی پر کوئی فوقیت نہیں مگر صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

بظاہر اس ارشاد کی اہمیت کا احساس شاید عام طور پر نہ کیا جائے لیکن اگر غور کروگے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اسلام کے ان حقائق میں سے ہے جسے کائنات انسانیت میں

بلند انقلابی حیثیت حاصل ہے ۔ یقیناً عالمِ انسانیت کے روبرو ایسے انقلابی اصول بہت کم پیش ہوئے ۔

یہ کسے معلوم نہیں کہ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور کون ہے جو ایک باپ کی اولاد ہیں صرف نسل اور خون کی بنا پر امتیازات کو معقول قرار دے ؟ پھر رنگ یا خط و خال یا وطن کا معاملہ اتفاقات پر موقوف ہے ۔ کسی کو رزق و معاش کی ضرورتیں کہیں لے گئیں، کسی کو کہیں لے گئیں ۔ رنگ اور خط و خال کا معاملہ عموماً ماحول پر مبنی ہوتا ہے ۔ جہاں سردی زیادہ ہوتی ہے وہاں کے باشندے زیادہ تر سرخ و سفید ہوتے ہیں ۔ جہاں سورج کی حدّت زیادہ ہوتی ہے وہاں جو لوگ رہتے ہیں ان کے رنگ کالے ہوتے ہیں معتدل خطوں میں بسنے والے اصحاب رنگ نہ زیادہ سیاہ ہوتے ہیں نہ زیادہ سُرخ و سفید بلکہ عموماً سانولے ہوتے ہیں پھر کسی نے کھیتی باڑی شروع کر دی کسی نے تجارت کو پیشہ بنا لیا ۔ کسی کو ملازمت راس آئی ۔ کوئی ریوڑ چرانے لگا ۔ بعض دولت مند بن گئے اور انھوں نے بڑی بڑی جایدادیں پیدا کر لیں ۔ بعض غریب رہے اور اُن کی زندگی پریشان حالی میں بسر ہوتی رہی ۔ بہ ایں ہمہ دنیا نے رنگ، نسل ، دولت ، وطن یا اس قسم کے دوسرے اتفاقی معاملات کو شرافت ، عزّت ، برتری اور بلندی کا معیار بنا لیا ۔ اقبالؔ نے اسی حالت سے متاثر ہو کر " خفتگانِ خاک سے استفسار " میں کہا تھا کہ اس دنیا میں تو حکومتوں کی حیثیت بلبلے سے زیادہ نہیں اور دولت ہی کو شرافت کا معیار قرار دیا جاتا ہے ۔ کیا دوسری دنیا میں بھی جہاں تم پہنچے ہو یہی کیفیت ہے ؟

واں کی عزّت بھی ، حکومت بھی حباب آسا ہے کیا؟
واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا؟

اسلام نے اس دنیا میں سب سے پہلے یہ صدا بلند کی کہ شرافت ، نیکی ، عزت اور حسن و خوبی کا معیار تقویٰ اور پرہیزگاری ہے ۔ دولت ، رنگ ، نسل ، خون وغیرہ

سب چیزیں بے حقیقت ہیں۔ یہ معمولی بات نہ تھی بلکہ انسان کی توجہ ہر مادی چیز سے ہٹا دی اور صرف حسن عمل، فضائل اخلاق، خوبیٔ روش اور نیکی کو حقیقی نصب العین بنا دیا۔ گویا جد و جہد کی جائے تو اس راہ میں کہ نیکی اور حسنِ عمل کی زیادہ دولت کون فراہم کرتا ہے۔ نہ یہ کہ سونے اور چاندی کے ڈھیر کس کے پاس زیادہ جمع ہوتے ہیں؛ رنگ کس کا گورا یا سفید ہے؛ املاک کس کے پاس زیادہ ہیں؛ روپے کے بل پر زیادہ آدمیوں کو کون اپنے ارد گرد جمع کر لیتا ہے؛

اقبالؔ نے داخلی محبت کو مسلمانوں کا ایک اہم نصب العین قرار دیا یعنی یہ کہ وطن، رنگ، نسل وغیرہ کو نہ دیکھیں بلکہ سب جذبۂ محبت سے ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک ملت بن جائیں پھر یہی پیغام محبت دنیا کو پہنچائیں۔ فرمایا:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مسلمانوں کی زندگی کا خلاصہ اور نچوڑ کیا ہے؛ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے فضائل کو مسلک بنا کر مسلسل و پیہم عمل، اس عمل کے نتائج حسنہ کے بارے میں پختہ یقین اور انسانوں کے ساتھ برتاؤ میں محبت، جو دنیا میں مسخر کر لے۔ یہ شمشیریں اور یہ تلواریں ہیں جن سے مردان حق جہاد زندگی میں کام لیتے ہیں۔ یہ حقیقت ذہن نشین کر لینے میں کسی کو دقت پیش نہیں آسکتی کہ اگر انسانوں کے دل میں اترنا ہے تو لازم ہے کہ ان کے ساتھ محبت، ہمدردی، خیر خواہی اور خیر سگالی کا برتاؤ کیا جائے۔ بے شک بعض اوقات مصیبت خیز فتنوں کے انسداد کے لیے قوت سے کام لینا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے جس طرح کوئی انسان بیمار ہو جائے تو اس کے لیے علاج کی مختلف تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں مثلاً کبھی منضج پلایا جاتا ہے اور جلاب دیا جاتا ہے کہ تنقیہ ہو جائے۔ فصد لی جاتی ہے کہ فاسد خون نکل جائے مگر صحت و قوت کی بحالی بلکہ اس میں اضافے کی طبعی تدبیر یہی ہے

کہ اچھی، زود ہضم اور جزوِ بدن بننے والی غذاؤں کا انتظام کیا جائے۔ ہر انسان کو یقین دلایا جائے کہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے وہ سراپا ہمدردی، نیکی اور خیرسگالی پر مبنی ہے۔

محبت کا یہی پیغام تھا جو صدرِ اوّل کے عرب لے کر اپنے وطن سے باہر نکلے اور بہت ہی تھوڑی مدت میں شرق و غرب کے عالی شان ایوان ان کی ناموری کے آوازے سے گونجنے لگے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے تبلیغ اسلام کا کوئی خاص اہتمام کیا تھا؟ مگر جہاں جہاں ان کے قدم پہنچے، پوری آبادیاں دینِ حق کی حلقہ بگوش بن گئیں بلکہ عربی کو انھوں نے مادری زبان کے طور پر اختیار کر لیا۔ یہ سب اس محبت کے کرشمے تھے جسے اقبال نے فاتحِ عالم قرار دیا۔ آج عرب سے مغربِ اقصیٰ تک کیا کیفیت ہے؟ کیا حجاز سے کہیں بڑھ کر بیروت و شام و مصر عربی زبان کے مایہ ناز مرکز نہیں؟ کیا خلیج فارس سے اوقیانوس تک بہ اختلافِ لب و لہجہ عربی زبان نہیں بولی جاتی اور ان کی اساسِ فخر اسلام کے سوا بھی کچھ ہے؟ کیا ایران، ترکستان، افغانستان، بلوچستان، سندھ میں آپ کو کوئی ایسی پیچیدگی نظر آئی جیسی پنجاب، دہلی، یوپی یا پاک و ہند کے دوسرے حصوں میں ہمارے سامنے پیدا ہوئی؟ اس لیے کہ یہاں اسلام عربوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ عجمیوں کے ذریعے سے پہنچا تھا کوتاہ اندیشوں نے حقائق کا صحیح اندازہ نہ کیا مگر کیا ملّت اسلامیہ کے لیے یہ انتہائی فخر کا سامان نہیں کہ اس کے عظیم القدر محدث، عظیم القدر فقیہ، عظیم القدر لغت نگار، عظیم القدر فلسفی بڑی تعداد میں عجمی تھے جنھوں نے عربی زبان کے دامن کو گوناگوں علوم کے جواہر ریزوں کا گنجینہ بنا دیا، اس لیے کہ مسلمان ہو جانے کے بعد عربی ان کی مایہ ناز علمی زبان بن گئی تھی۔ وہ آپس میں بات چیت کے لیے خواہ کوئی زبان استعمال کرتے ہوں مگر سوچتے تھے تو قرآن مجید کی زبان میں، لکھتے تھے تو قرآن کی زبان میں، خطبے دیتے تھے تو قرآن کی زبان میں۔ یہ عربوں کی شانِ محبت کے کرشمے تھے جو جگہ جگہ ایسی شکل میں نمایاں ہوئے کہ ان کی کوئی نظیر شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے۔

یہ آپ کے سامنے انگریزی اقتدار کی داستان کے تمام اوراق کھلے پڑے ہیں جو ابھی چند سال پیشتر تک دنیا کا بہت بڑا اقتدار تھا اور جو ابتدائی ظہور سے کم از کم تین چار سو سال تک خاصا پایدار رہا۔ انگریزی زبان نے نئے ملک پیدا کر لیے لیکن کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ دوسری قوموں اور ملکوں سے اس زبان کے لیے ویسے عظیم الشان کام کا عشر عشیر بھی انجام پایا جو عجمیوں نے عربی زبان کے لیے انجام دیا؛

غرض دنیا کو تلوار سے نہیں، شمشیر زنی سے نہیں، کشور کشائی سے نہیں، دولت و ثروت سے نہیں صرف محبت اور خیر خواہی ہی سے راہِ حق پر لایا جا سکتا ہے اور صرف محبّت و خیر خواہی ہی سے سب کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر جھکائی جا سکتی ہے۔ اقبالؔ کی طرف سے ابتدا میں بھی یہی پیغام تھا اور آخر میں بھی یہی پیغام تھا۔ اگر آخر میں کہا:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

تو ابتدا میں بھی اقبالؔ کی زبان پر یہی پیغام تھا:

رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے
زندگی تیری جہاں میں دل ربایانہ تو ہو

یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے "اسرارِ خودی" میں ایک مستقل عنوان باندھا کہ "خودی از عشق و محبت استحکام مے پذیرد"، مسلمان کے عشق کا مرکز حضور رحمۃ للعٰلمین کی ذات با برکات ہے۔ حضور کی شان جمالی مسلمانوں کے لیے زندگی کی تاریک راہوں میں عمل کی تجلّی زار ہے۔

اب میں صرف ایک نکتے کی طرف چند اشارے کروں گا اور اس مقدمے کو ختم کر دوں گا اور وُہ یہ کہ اقبالؔ کے جن افکار و مضامین کو دورِ آخر میں ان کی عظمت کا خاص معیار قرار دیا گیا وُہ ابتدائی دور میں بھی موجود تھے اگرچہ حسن اظہار و لطف بیان کی وُہ شان نہ تھی جو آخری دور کے لیے وجہ امتیاز بنی۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

دورِ کمال کی ایک غزل ہے جس میں فرماتے ہیں :

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

دیکھیے ابتدائی دور کی ایک غزل میں بھی یہ مضمون موجود ہے :

عقل کی فوج نے ہر جنگ میں منہ کی کھائی　　عشق میدان میں آیا تو ظفر یاب ہوا

ایک مرکزی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو سعی و کوشش اور جد و جہد کی تعلیم دی گویا ان کا کلام " لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى " کی ایک نہایت دل پذیر تفسیر ہے۔ وہ سکون کو موت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اس کی مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

" پیامِ مشرق " میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

ساحل افتادہ گفت ، گرچہ بسے زیستم　　ہیچ نہ معلوم شد ، آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت　　ہستم اگر می روم ، گر نہ روم نیستم

اسی طرح فارسی کا کوئی شاعر کہہ گیا ہے :

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست
ما زندہ بہ آنیم کہ آرام نہ گیریم

اور اگر " خواہی حیات اندر خطر زی " تو اعادے کا محتاج نہیں۔

دیکھیے ابتدائی دور میں بھی اس قسم کے مضامین جا بجا ملتے ہیں مثلاً :

کر نہ تقدیر کے شکووں سے خودی کو رسوا　　بہر تدبیر عیاں عالم اسباب ہوا

ضربِ شمشیرِ حوادث سے نہ کھو قوتِ ضبط　　سخت کوشی ہو دنیا میں سپر کی صورت
دہر میں ذوقِ فنا تجھ کو ہے پیغامِ فنا　　تازہ رکھ جوشِ سفر شمس و قمر کی صورت

خودی اقبال کا خاص مضمون ہے۔ اس کی جھلک ابتدائی دور کے اشعار میں بھی ملتی ہے:

خودی نے عطا کی مجھے خود شناسی　　ترا حسن دائم میرے رو برو ہے

نہ ہو جب تلک دل میں ایمان کامل　　خودی بھی فسانہ خدا بھی فسانہ
خودی کی حفاظت کوئی مجھ سے سیکھے　　غریبی میں انداز ہیں خسروانہ

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں　　جنتی ہوگا، فرشتوں میں نمایاں ہوگا

قلب انساں سے چلی آتی ہے فطرت کی صدا　　خود کو جو جان گیا سمجھو، خدا یاب ہوا

فقیری، قلندری، توکل اور خدا کے سوا ہر شے سے بے نیازی اقبال کے وہ اوصاف ہیں جو آخری دور کی طرح پہلے دور میں بھی ممتاز تھے:

کون جانے کہ قلندر ہے شہنشاہ عشق　　فرش خاکی بھی مجھے بستر کمخواب ہوا
ہر ضرورت ہوئی پوری تو خدا سے اقبال　　میں نہ تکلیف میں شرمندۂ احباب ہوا

وہ دنیا کو شگفتہ اور خوشحال و خوش باش دیکھنے کے آرزومند تھے۔ فرماتے ہیں:

ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام　　سیر اس باغ میں کر باد سحر کی صورت

آخری دور کا ایک نہایت مشہور شعر یہ ہے:

نشان مرد مومن با تو گویم　　چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ وفات سے تھوڑا عرصہ پیشتر کہا گیا تھا۔ لیکن یہ مضمون ابتدائی دور کے ایک شعر میں بھی موجود ہے:

مرد مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے　　موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہوگا

اس باب میں ابن یمین کی ایک رباعی قابل ملاحظہ ہے:

منگر کہ دل ابنِ یمیں پُر خوں شد　　بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد
مصحف بہ کف و چشم بہ رہ، روئے بہ دوست　　با پیک اجل خندہ زناں بیروں شد

"شمع اور شاعر" میں ایک جگہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

بے خبر تو جوہر آئینہ ایّام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اس قسم کی صدائیں ابتدائی دور میں بھی سنی جا سکتی ہیں۔ مثلاً:

تری ہستی ہی پہ موقوف ہے نظم عالم　　دست قدرت کا بنایا ہوا شہکار ہے تو
ہو یقیں مردہ تو ہے سنگ بھی تجھ سے بہتر　　ہو یقیں زندہ تو پھر حیدر کرار ہے تو

غرض ان اشعار کو محفوظ کر دینا میرے نزدیک حد درجہ ضروری تھا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس طرح اقبال کے دل و دماغ کی ارتقائی منزلوں کا اندازہ کرنے کے لیے مزید سامان مہیا ہو سکتا ہے نیز اس لیے کہ جو کچھ آخری دور میں بہتر، پختہ تر اور دل آویز تر انداز میں کہا گیا وہی ابتدائی دور میں بھی کہا گیا۔

اپنی بساط کی حد تک ترتیب کو زیادہ سے زیادہ مفید و نفع بخش بنانے کی کوشش کی۔ جا بجا حواشی لکھے۔ اکثر نظموں کے آغاز میں تمہیدوں کے ذریعے سے پس منظر واضح کیے جو کلام اقبال کے مطالعے میں یقیناً معاون ہوں گے، نیز نظموں کی تاریخی حیثیت بھی اس طرح محفوظ ہو جائے گی۔ بعض اصحاب نے غالباً عجلت میں بعض ایسی نظمیں اقبال سے منسوب کر دیں جو حقیقتہً ان کی نہ تھیں، مثلاً "مدینہ کے ایک کبوتر کی یاد میں"۔ یہ نظم مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی تھی اور ۲۲۔ نومبر ۱۹۱۷ء کے روزنامہ "ستارہ صبح" میں شائع ہو چکی تھی۔ اس کے آغاز میں مولانا نے تحریر فرمایا تھا:

جسے (کبوتر کو) علامہ اقبال کے ارادت کیش ہاتھوں نے پالا تھا مگر

۲۰۔ نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک بلّی کا شکار ہو گیا۔

نظر بہ ظاہر مولانا کو کبوتر کے مارے جانے کا علم ہوا تو انھوں نے بے تکلف نظم کہہ کر شائع کر دی چونکہ کبوتر اقبال کا پالا ہوا تھا اس وجہ سے بعض اصحاب نے سمجھا کہ اصل نظم بھی اقبال ہی کی ہوگی، حالانکہ اس کے آٹھ شعروں میں ایک بھی نہیں جس میں اقبال کے انداز کی خفیف سی جھلک پائی جاتی ہو اور واضح رہے کہ یہ نظم ابتدائی دور کی نہ تھی بلکہ ۱۹۱۷ء کے اواخر کی تھی۔ جب اقبال فکر و نظر کے اعتبار سے بلوغ کی انتہائی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔

اقبال کے سلسلے میں بہت سے گراں قدر کام ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مہلت اور توفیق مرحمت فرمائے تو وہ ضرور انجام پا جانے چاہئیں۔ ان میں سے ایک نہایت اہم اور ضروری کام ان کی سیرت کا بھی ہے۔ اس میں جو کچھ ہونا چاہیے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مگر ظاہر ہے، مقصود یہ نہیں کہ ان کی زندگی کے بعض معروف و غیر معروف واقعات کو ایک خاص ترتیب سے پیش کر دیا جائے۔ مقصود یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب مرتب ہو جائے جس میں ایک طرف اس مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے دوسری طرف اس کے کلام کی تمام ارتقائی منزلیں واضح طور پر معین ہو جائیں تاکہ اسے پڑھ کر اقبال کا مطالعہ کرنے کے شائقین کتابیں دیکھنا شروع کریں تو ان کے ذہنوں میں شخصیت کا روشن و معین تصوّر موجود ہو اور وہ کتاب اس سفر کے لیے شدّ رحال کرنے والوں کو زاد راہ کا کام دے سکے۔

اب تک اپنے علم و ہنر کی بے مایگی دامن کش رہی لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ اگر سالہا سال اس دریائے فضائل و مکارم کے کنارے گزار چکنے کے بعد استفادہ و استفاضہ کا اتنا حق بھی ادا نہ ہو سکا تو یہ مجرمانہ کوتاہی ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ حق ادا کرنے اور یہ فرض بجا لانے کی ہمت عطا فرمائے۔

زباں زنکتہ فرو ماند و راز من باقی است
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی است

مکاتیبِ اقبالؔ بنام گرامی

مولانا گرامی مرحوم کے نام مکاتیب اقبال کا یہ مجموعہ اس اعتبار سے تو بیش بہا نعمت ہے ہی کہ یہ اقبال کی تحریرات ہیں جن کا ایک ایک حرف چشم بصیرت کے لیے کحل الجواہر ہے لیکن ان کی بیش بہائی کا ایک خاص پہلو بھی ہے یعنی یہ مکاتیب اس خوش ذوق و خوش فکر شاعر کے نام ہیں جو اپنے دور میں کلاسیکی فارسی شاعری کے کامل الفن اداشناسوں میں سے بلند مرتبے پر فائز تھا اور ان مکاتیب میں اقبالؔ کی شاعرانہ حیثیت کے جو گوشے بے نقاب ہوئے ہیں وہ غالباً کسی دوسرے مکتوب الیہ کے ساتھ مکاتیب میں واضح نہیں ہوئے اور نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ دوسرے مکتوب الیہم میں سے بیشتر تو شاعر تھے ہی نہیں اور جو تھے ان کا ذوق شعر گرامی کے برابر نہ تھا۔

گرامی سے اقبالؔ کے دوستانہ روابط بظاہر اسی زمانے میں قائم ہو گئے تھے جب اقبالؔ کی شاعری ہلال عید کی طرح انجمن حمایت اسلام اور مخزن کے افق پر جلوہ آرا ہوئی تھی۔ ابتدا ہی سے اس کی شان بھی بالکل نرالی تھی اور خداداد "تاثیر و پذیرائی" کی جو غیر معمولی دولت اس کے حصے میں آئی وہ بھی بے مثال تھی، حالانکہ وہ اقبالؔ کی شاعری کی صبح اوّل تھی اور وہ شاعری ارتقاء کی اس منزل پر نہیں پہنچی تھی جہاں سے اس نے ایک مستقل دعوت اور ایک معیّن پیغام کا قدوسی خلعت پہنا۔ پھر قدرت نے اقبالؔ کو اس منصب عالی کی مسند پہ بٹھایا جو صدیوں کے بعد کسی "حکیم" یا "نے نواز" سے زیب و زینت پاتی ہے۔

اس وقت تک اقبالؔ صرف اردو میں شعر کہتے تھے اور فارسی کی ایک نظم کے سوا کوئی چیز منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ گرامی محض فارسی کے شاعر تھے اور ان کا رنگ وہی تھا جو اکبری عہد کے بعض مشہور اساتذہ کے لیے طغرائے امتیاز تھا۔ اقبالؔ اور گرامی میں

قدر مشترک اس وقت تک صرف یہ تھی کہ دونوں نے مشاہیر اساتذۂ فارسی کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا اور دونوں کا ذوق شعر بہت بلند تھا۔

اس ربط و تعلق سے قریباً آٹھ دس سال بعد اقبال کی توجہ فارسی کی طرف منعطف ہوئی۔ اس کے خاص اسباب تھے۔ سب سے بڑا اور اہم سبب یہ تھا کہ اقبال کے نزدیک ہوشمندی کے کسی بھی دور میں شاعری محض دماغی تفریح یا خالی انجمن آرائی کا ذریعہ نہ تھی وہ بے مقصد شاعری کو ضیاع قوت و وقت سمجھتے تھے۔ خاص قومی مقصد اور نصب العین تو پہلے سے ان کے سامنے تھے لیکن جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے رفتہ رفتہ ہی ان کے قلب صافی پر منشرح ہوا۔ انشراح کامل کے بعد انھیں اندازہ ہو گیا کہ اُردو زبان ان کے پیغام کے لیے ضرورت کے مطابق سازگار نہیں ہو سکے گی لہٰذا انھیں فارسی اختیار کرنی پڑی، جو دقیق و بلند افکار کے اظہار کے لیے اُردو سے زیادہ ثروت مند تھی۔ نیز کئی اکابر اس زبان سے حکمت، فلسفے، تصوّف، اخلاق، سیاسیات اور رزم و پیکار کے دائروں میں کام لے چکے تھے۔ اقبال خود فرماتے ہیں:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

علاوہ بریں فارسی نے کم از کم اسلامی ممالک میں فی الجملہ بین الملی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی نیز فضلاء مغرب کا بھی خاصا بڑا طبقہ اس سے شناسا تھا یا کہہ لیجیے کہ بالکل ناآشنا نہ تھا۔ گویا فارسی کے ذریعے سے اقبال کا پیغام براہِ راست وسیع تر طبقوں تک پہنچایا جا سکتا تھا۔

اس فیصلے کے بعد نیز دعوت کے ابتدائی مراحل میں اقبال کو جن ذہنی کاوشوں اور دماغی مشقتوں سے سابقہ پڑا ہوگا ان کی اصل داستان تو خود ان کے سوا کوئی نہیں سنا سکتا تھا۔ ایسا ہی مرحلہ میرزا غالب کو بھی پیش آگیا تھا۔ وہ خود کہتے ہیں:

طریقِ وادیٔ غم را کسے نبودہ رفیق
خود از صعوبت ایں راہِ پُر خطر گویم

ممکن ہے ان اصحاب سے "طریقِ وادیٔ غم" کی کچھ کیفیت معلوم ہو سکے، جنھوں نے اصلاح و ارشاد کی دعوتوں کے نقشے تیار کیے اور انھیں مختلف دوروں اور خطوں میں عزم و ہمت کے ساتھ عملی شکل دینے کے لیے اپنی جانوں پر محنتوں اور مشقتوں کے پہاڑوں کا بارِ صابرانہ برداشت کر لیا۔

اقبال کے لیے یہ صعوبتیں اور مشقتیں دوگونہ تھیں۔ اوّل اصل دعوت کی حکیمانہ ترتیبات جو انتہائی غور و فکر اور حقیقۃً دماغ سوزی کی طلبگار تھیں۔ دوم ایک نئی زبان میں اظہار و ابلاغ کے لیے مہارت کاملہ پیدا کر لینا جس کا مطالعہ بے شائبہ ریب بہت وسیع پیمانے پر کر چکے تھے تاہم اس میں شعر گوئی کی مشق نہ تھی اور پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرنے کے لیے انتہائی مشاقی درکار تھی۔

صعوبت کشی اور مشقت طلبی کے اس صبر آزما دور میں اقبال کو طبعاً فارسی شاعری کے کسی بالغ نظر رمز شناس کے ساتھ مذاکرات کی ضرورت پیش آئی۔ فکر و نظر کے اعتبار سے نہیں، کیونکہ "میخانۂ توفیق" سے فکر و نظر کے جن رشحات کا رخ قدرت نے اقبال کے پیمانۂ دل و دماغ کی طرف پھیر دیا تھا، اس میں کوئی دوسری شخصیت جزواً بھی شریک و سہیم نہیں ہو سکتی تھی، صرف اسلوب بیان اور اندازِ اظہار کے اعتبار سے بعض نازک امور میں مذاکرات ناگزیر تھے۔ ان مذاکرات کے لیے گرامی نہایت موزوں تھے اس لیے کہ اوّل فارسی اساتذہ کے کلام پر انھیں عبور حاصل تھا۔ دوم وہ تیس پینتیس برس سے

ان اساتذہ کے انداز میں پورے انہماک کے ساتھ شعر کہتے رہے تھے۔ پاک و ہند میں ایسی دوسری مثال خواجہ عزیز الدین مرحوم لکھنوی کی تھی جو بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور ایک مکتوب میں خود اقبال نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

غرض پیش نظر مجموعۂ مکاتیب اسی عہدِ رفاقت و مذاکرات کا ایک مرقع ہے جس کی بیش بہائی کسی تشریح کی محتاج نہیں اور اقبال نے انھی مذاکرات کی یاد تازہ کرتے ہوئے گرامی کی وفات کے قطعے میں فرمایا تھا:

یاد ایامے کہ با او گفتگو ہا داشتیم　　اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنا

خود گرامی نے اقبال کی فکری معجز نمائیوں سے مسحور ہو کر مذاکرات کا حق ایسے انداز میں ادا کیا، گویا خود اپنی بقائے شہرت کو بھی انھی مذاکرات پر موقوف و مبنی قرار دے لیا۔ گرامی فطرۃً کاہل اور حرکت سے بدرجۂ غایت نفور تھے جہاں بیٹھ جاتے وہاں سے ان کے لیے اٹھنا تو خیر خارج از بحث تھا ہی، انھیں اٹھانا بھی بہت مشکل تھا۔ تاہم ماحول میں خفیف سی بھی ناسازگاری محسوس کرتے تو چند لمحے بھی وہاں گزارنا ان کے لیے ہزاروں مشقتوں کے مقابلے میں زیادہ ناخوشگوار ہو جاتا۔ بر ایں ہمہ جب وہ اقبال کے پاس پہنچ جاتے تو انھیں اٹھانے کے لیے عزیزوں کو بھی عجیب و غریب تدبیریں اختیار کرنی پڑتیں۔ حضرت اقبالؒ کی زبان مبارک سے مولانا گرامی کے جو واقعات بارہا سنے انھیں بیان کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ تاہم چند کہانیاں ضرور لکھ دینی چاہئیں جن سے گرامی کی طبیعت پر روشنی پڑتی ہے اور یہ کہانیاں اس مجموعہ مکاتیب میں بیان نہ ہوں گی تو اور کہاں لکھی جائیں گی؟

ایک مرتبہ مولانا گرامی کو حضرت اقبالؒ کے پاس آئے ہوئے خاصا عرصہ گزر گیا یہاں تک کہ بلانے کی غرض سے بیگم گرامی کو اپنی شدید علالت کا تار دینا پڑا۔ تار کا مضمون سن کر گرامی بہت پریشان ہوئے اور کہا کہ مجھے ابھی سٹیشن پر پہنچا دیا جائے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے تھے کہ مجھے یقین تھا، علالت کا ذکر محض اس لیے کیا گیا کہ مولانا گرامی فوراً چلے آئیں۔

چنانچہ میں نے مولانا سے کہا کہ تشویش نہ کریں بیگم بحمداللہ بالکل بہ خیریت ہیں اور ہم ابھی جوابی تار بھیج کر ان کی خیریت کی اطلاع منگا لیتے ہیں لیکن مولانا کو جانے پر اصرار تھا۔ حضرت علّامہ فرماتے تھے کہ سردی کا موسم تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے اور کوئی ٹرین اس وقت جالندھر کی طرف جانے والی نہ تھی۔ آخر میں نے کہا کہ بہتر، ابھی آپ کو بھجوا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی کہا کہ ایک رباعی کہی تھی تین مصرعے تو ہو گئے چوتھا مصرعہ حسب دلخواہ نہیں ہو سکا۔ مولانا گرامی نے فرمایا: ذرا مجھے بھی سنائیے۔ تین مصرعے سنتے ہی وہ حسبِ عادت فکر میں منہمک ہو گئے اور تار سے جو تشویشات پیدا ہوئی تھیں، وہ سب بظاہر بھول گئے۔ کسی قدر غور و فکر کے بعد ایک مصرعہ سنایا۔ میں نے (حضرت علّامہ نے) کہہ دیا کہ مولانا اس کا فلاں حصّہ مزید توجہ کا محتاج ہے۔ غرض اسی طرح گھنٹے بھر میں چند مصرعے کہے، لیکن میں ان میں کوئی نہ کوئی نقص نکالتا رہا۔ پھر میں اوپر کی منزل میں جا کر سو گیا۔ رات کے تین بجے علی بخش (حضرت علامہ کا ملازم) نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ مولانا یاد کر رہے ہیں۔ حضرت علّامہ آئے اور پوچھا کہ مولانا خیریت ہے؟ بولے: ہاں خیریت ہے میں نے مصرعہ کہہ لیا تھا اور سوچا کہ صبح کا انتظار نہ کروں، ابھی سنا لوں۔ حضرت علّامہ فرماتے تھے کہ مصرعہ بڑا ہی نادر تھا میں نے اسے بہت سراہا۔ بولے: اب میرا جی سنگترے کھانے کو چاہتا ہے۔ سردی کا موسم، رات کے تین چار بجے کا عمل۔ تاہم حضرت علّامہ نے علی بخش کو بھیج کر کسی میوہ فروش کو اٹھایا اور سنگترے منگائے۔ چائے تیار کی اور یہ چیزیں مولانا کے سامنے رکھیں تو خوش ہوئے۔ اس اثنا میں تار کا واقعہ یاد سے بالکل محو ہو چکا تھا۔

مولانا گرامی بے حد نازک مزاج بھی تھے اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ دل کی بات ہر فرد کے سامنے بے تکلف کہہ دیتے تھے اگرچہ وہ کتنی ہی ناخوشگوار ہو۔

یہ موجودہ صدی کے عشرہ ثانی کے واقعات ہیں جب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ ملکیوں کے لیے انگریزی حکومت میں بہت بڑا عہدہ تھا۔ ایسے عہدیداروں کو ڈپٹی

کہتے تھے۔ حضرت علامہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ امرتسر کا ایک ڈپٹی مولانا گرامی کے پاس پہنچا اور مختلف ترغیبات سے انھیں چند روز کے لیے اپنے ساتھ امرتسر جانے پر راضی کر لیا۔ اس ڈپٹی کو فارسی کا بھی اچھا ذوق تھا، مولانا راضی ہو گئے۔ تاریخ مقرر کر لی گئی جب ڈپٹی صاحب مقررہ تاریخ پر لینے کے لیے آئے تو مولانا حرکت و جنبش سے نفرت کے باعث جانے پر آمادہ نہ تھے مگر وعدہ کر چکے تھے اس لیے علی بخش کو حکم دے دیا کہ سامان باندھ دو۔ اس زمانے میں موٹریں بہت کم تھیں اور سواری کے لیے زیادہ تر بگھیاں ہی استعمال ہوتی تھیں۔ علی بخش نے مولانا کا سامان بگھی کی چھت پر رکھ دیا اور مولانا حقے کے چند کش لگانے کے لیے بیٹھ گئے۔ اس اثنا میں ڈپٹی صاحب کی جو شامت آئے تو اپنے شعر سنانے شروع کر دیے۔ چند شعر مولانا سن چکے تو ٹھیٹھ پنجابی زبان میں فرمایا: "چھڈ یار میں نئیں جاندا او تھے بیٹوں ایہو جیہے ڈھیکے شعر سناویں گا (چھوڑ یار میں نہیں جاتا مجھے وہاں ایسے ہی لغو شعر سناؤ گے)، چنانچہ علی بخش کو حکم دے دیا گیا کہ سامان واپس لے آؤ۔ ڈپٹی صاحب کی کوئی منت و سماجت مولانا کو امرتسر تشریف لے جانے پر راضی نہ کر سکی۔

تاہم یہی گرامی پے در پے کئی کئی ہفتے اقبال کے ہاں ٹھہرے رہتے تھے اور ایک لمحے کے لیے بھی بدمزہ نہیں ہوتے تھے۔

میں ان تمہیدی یا تعارفی کلمات کو طول نہیں دینا چاہتا مقصود حقیقی محض یہ تھا کہ اوّل اس دور کا سرسری نقشہ سامنے آ جائے، جس کا ایک مرقع یہ مکاتیب پیش کر رہے ہیں نیز معلوم ہو جائے کہ اقبال کو اس وقت کیوں گرامی سے مذاکرات کی ضرورت پیش آئی تھی اور ان مذاکرات کے حدود کیا تھے؟ افسوس کہ تمام مکاتیب محفوظ نہ رہ سکے اور ان کا ایک حصہ یقیناً ضائع ہو گیا جیسا کہ آپ پر مکاتیب کے مطالعے سے واضح ہو جائے گا اگر وہ بھی مل جاتے تو ایسی کئی اور دل آویز صحبتوں اور مذاکروں سے تمتع کا موقع مل جاتا۔

ان مکاتیب کی ترتیب و تہذیب میرے عزیز دوست اور دیرینہ رفیق مولوی محمد عبداللہ صاحب

قریشی نے پایۂ تکمیل کو پہنچائی اس سلسلے میں انھیں جتنی محنت اٹھانی پڑی اس کا کسی قدر اندازہ مقدمے نیز مکاتیب کے حواشی سے ہو سکے گا۔

یہ مکاتیب جس وقت لکھے گئے تھے اس وقت فریقین (اقبالؔ و گرامیؔ) کو خیال بھی نہ ہوگا کہ یہ محفوظ رہیں گے اور کبھی ایک مرتب کتاب کی شکل میں منظرِ عام پر آئیں گے پھر انھیں دو بلند منزلت شخصیتوں کے درمیان ایک علمی مذاکرے کی حیثیت حاصل تھی اور صرف وہی باتیں معرضِ تحریر میں آئیں جو اصل معاملات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لیے ناگزیر تھیں۔ لیکن فاضل مرتب نے مکاتیب کے ایک ایک حصّے کی توضیح کے لیے بیسیوں کتابوں، رسالوں، مقالوں اور تحریروں سے معلومات کے جواہر پارے فراہم کر کے نگینوں کی طرح جڑ دیے تاکہ کوئی مطلب و مفہوم غیر واضح نہ رہے۔ ان میں جن جن افراد و وقائع کا ذکر اشارۃً آیا ہے قریشی صاحب نے ان کے متعلق ضروری تفصیل اس حد تک مہیا کر دی کہ حرفِ مطلب کے ذہن نشین کر لینے میں خوانندگان کرام کو سہولت رہے اور کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ہر تشریح کے لیے مستند حوالے دیے۔ اقبالؔ یا گرامیؔ کے جس شعر یا جن اشعار کی طرف مکاتیب میں اشارہ کیا گیا ہے ان کا سراغ لگایا اور انھیں درج کر دیا، جس معاملے کے متعلق گرامیؔ کے مکاتیب سے کچھ معلومات مل سکتی تھیں وہ مکاتیب حواشی میں درج کر دیے۔ قطعاً شبہ نہیں کہ ان کی یہ دیدہ ریزی اور دماغ کاوی ہر اعتبار سے قابلِ قدر اور مستحق ستایش ہے۔ مکاتیب کا ہر مجموعہ ایسی ہی سعی و کاوش کے بعد پڑھنے والوں کے لیے حقیقۃً نافع اور سود مند ہو سکتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ مکاتیب کا یہ مجموعہ "اقبالیات" کے سلسلے کا ایک قابلِ قدر مرقع بن گیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ میرے عزیز دوست قریشی صاحب کی بھی اہم علمی یادگاروں میں شمار ہوگا۔

"تمہید و تعارف" مکاتیبِ اقبال بنام گرامی"

اقبالؔ درونِ خانہ

عظیم القدر ہستیوں کے سوانح حیات لکھنا سہل بھی ہے اور حد درجہ مشکل بھی۔ سہل یوں کہ معروف شخصیتوں میں سے شاید ہی کوئی ہو جس کے متعلق ضروری واقعات فراہم کر لینا زیادہ محنت و مشقت کا باعث سمجھا جائے۔ یہ واقعات سامنے رکھ کر ہر قلم کار اپنی بساط و استعداد کے مطابق ایک مرقع بہ آسانی ترتیب دے سکتا ہے۔ لیکن شخصی سوانح کی ترتیب کا مقصد میرے تصوّر کے مطابق یہ نہیں ہوتا کہ کسی شخصیت کے متعلق جو معلومات ادھر ادھر سے فراہم کی جا سکیں، انھیں ایک خاص ترتیب سے قلم بند کر دیا جائے، اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ترتیبِ کتاب کا انداز ایسا رکھا جائے جس میں شخصیت کے خصوصی پہلو خود بخود ابھر کر روشن صورت میں سامنے آتے جائیں اور پڑھنے والے کو اندازہ ہوتا جائے کہ شخصیت میں عظمت و امتیاز کے اہم خصائص کون کون سے ہیں اور اس نے کن وجوہ سے نظروں میں گوہرِ شہوار یا ستاروں میں ماہ و خورشید کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ شخصیت کو بہر حال زیادہ سے زیادہ صحیح، طبعی اور بے ساختہ صورت میں منظرِ عام پر پیش ہونا چاہیے، تصنّع اور بناوٹ کی خفیف سی بھی آمیزش نہ ہونی چاہیے، جو سراسر طبعی ہوگی۔ ہر اداکاری کے لیے موقع اور محل کی مناسبت سے روپ بھرنا جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن شخصیت نگاری میں ایسا معمولی سا عمل بھی حقیقت و واقعیت کو مسخ کر دے گا۔

(۲)

مصوّر رنگ روغن کے ذریعے سے اور فوٹو گرافر کیمرے کی مدد سے تصویر تیار کر دیتا ہے جو اصل کے عین مطابق ہوتی ہے، مگر اسے محض بے جان شبیہ سمجھنا چاہیے، یعنی وہ شخصیت کی شکل و صورت، وضع و ہیئت اور خدوخال کا عام نقشہ تو سامنے لے آتی ہے،

مگر اس کی سیرت و کردار، اخلاق و عادات اور پسند و ناپسند کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی۔ حالانکہ زندہ و جاندار حقایقِ حیات وہی ہوتے ہیں، جنھیں محفوظ رکھنے کی غرض سے شخصیت نگاری کا فن معرضِ وجود میں آیا۔ مجسمہ بھی اصل کی مشابہت کا آئینہ دار تو بن سکتا ہے، مگر اس کے سوا کوئی کام نہیں دے سکتا۔ نہ مجسمے کی آنکھیں نظر سے بہرہ مند ہوتی ہیں کہ حسبِ دلخواہ اشارات سے کام لے سکیں، نہ جسم حرکت کر سکتا ہے کہ جب ضرورت محسوس ہو، آگے بڑھنے والے کو روک لے یا رُکے ہوئے کو آگے بڑھائے، نہ زبان قوت گویائی سے مزین ہوتی ہے کہ دل کی بات کسی کے کان تک پہنچا سکے۔

یہ شرف صرف سوانح نگار کے لیے مخصوص ہے جو رنگ روغن، دھوپ چھاؤں، ظل و نور یا سامانِ سنگ تراشی کی جگہ بولتے ہوئے الفاظ کے لباس میں شخصیت کو سجا کر پیش کرتا ہے اور وہ زندگی کے ہر دائرے میں بے تکلف چلتی پھرتی، اٹھتی بیٹھتی اور بولتی چالتی نظر آتی ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت، ایک ایک عمل اور ایک ایک ادا سے عظمت و امتیاز کی کرنیں پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس انداز کے سوانح حیات مرتب کر دینا ہر صاحبِ قلم کے بس کی بات نہیں۔ خواجہ نظامی مرحوم اس مقام میں کیا خوب فرما گئے ہیں:

سخن گفتن دیگر جان سفتن است
نہ ہر کس سزائے سخن گفتن است

غالباً یہی وجہ ہے کہ سوانح میں ان کتابوں کو زیادہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے جن میں شخصیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ حکایات و روایات کا اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہو اور وہ مستند ہوں۔ عام سوانح نگار جب شخصیت کے اخلاق و فضائل کا ذکر چھیڑتے ہیں تو ہر عنوان کے لیے مستند حکایات و روایات ہی سے سامانِ زیست فراہم کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں حقایق و شمایل خود بخود پیوستہ ہوتے جائیں۔ یہ طریقہ صاحبِ تحریر کے بیان سے کہیں زیادہ موثر و دلپذیر ہوتا ہے۔ دراصل یہ معاملہ سہلِ ممتنع کا سا ہے۔ دیکھنے میں بہت آسان

لیکن لکھنا پڑے تو چند فقرے بھی مرتب نہ ہو سکیں۔

(۳)

میں کہہ نہیں سکتا کہ اقبال مرحوم و مغفور کے سوانح میں اب تک کتنی کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔ اغلب ہے، ان کا خاصا بڑا حصّہ میری نظر سے نہ گزرا ہو، لیکن جس وضع و انداز کی کتاب کا ذکر میں اُوپر کر چکا ہُوں، ویسی تو شاید یہی کتاب مرتب ہوئی ہے جس کا مقدمہ لکھنے کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے ہر صفحے پر مرحوم و مغفور ابتدا سے آخری دور تک کا ملّا بے ساختہ انداز میں چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب کی بیشتر حکایات و روایات خود علامہ کے اہلِ خاندان کی زبان سے بیان کی گئی ہیں، جس سے زیادہ مستند شہادت کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ ان روایات میں بھی بڑا حصّہ مرحوم کی برادر زادی کا ہے، جن کی زندگی بچپن سے شادی تک علامہ مرحوم اور ان کی بیگم یعنی والدہ مرحومہ عزیزی جاوید اقبال کے ظلِ عاطفت میں گزری۔

جس حد تک مجھے علم ہے، اقبال مرحوم کا برتاؤ اپنے بھائی کے بچّوں کے ساتھ ویسا ہی تھا کہ جیسا کسی باپ کا برتاؤ اولاد کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ مرحوم کے نزدیک اپنے بچّوں اور بھائی کے بچّوں میں اصلاً امتیاز کی گنجایش ہی نہ تھی۔ برادر زادے علّامہ مرحوم ہی کے زیرِ نگرانی تعلیم و تربیت پا کر ملازم ہوئے۔ اس برتاؤ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بھائی ہی نے علّامہ مرحوم کی تعلیم خصوصاً ولایت کی تعلیم کے گراں قدر مصارف انتہائی خوش دلی سے برداشت کیے تھے، لیکن جس برادر زادی کی بیشتر روایات سے یہ کتاب مزیّن ہے، اسے مرحومہ بیگم اقبال نے بچپن ہی میں مُنہ بولی بیٹی بنا لیا تھا اور برابر اپنے ساتھ رکھا۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان گراں بہا معلومات کو محفوظ رکھنا ممدوحہ کا کتنا عظیم القدر کارنامہ ہے، جسے علّامہ مرحوم کے کروڑوں نیازمندوں کی گردن پر ایک دائمی احسان کی حیثیت حاصل رہے گی۔ پھر ممدوحہ کے صاحبزادے عزیزی خالد نظیر صوفی کا ہم سب کو

سپاس گزار ہونا چاہیے جن کی سعی و کاوش سے یہ گنجینۂ بے بہا مرتب ہو کر منظر عام پر آ رہا ہے۔

(۴)

میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، ساتھ ہی سوچ رہا ہوں کہ آج سے ایک مہینا اور بیس روز بعد حضرت علامہ مرحوم کی وفات پر تینتیس ۳۳ سال پورے ہو جائیں گے، حالانکہ آنکھیں بند کر کے تصورات کی باگ ڈھیلی چھوڑتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی والے بالاخانے یا میکلوڈ روڈ والی کوٹھی یا "جاوید منزل" کی خصوصی صحبتوں اور مجلسوں سے شرف یاب فیض ہو کر ابھی اٹھا ہوں۔ نہ گزشتہ تینتیس ۳۳ برسوں میں ایسی مجلسیں اور صحبتیں میسر آئیں اور نہ ان کے میسّر آنے کا بظاہر کوئی امکان ہے:

یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

علامہ مرحوم کے متعلق ان تینتیس برسوں میں جو کچھ بہ صورتِ مکتوب منظرِ عام پر آیا، ان میں مستقل کتابوں کے علاوہ مضامین و مقالات کو بھی شامل کر لیا جائے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے، ذکر و بیان کا یہ نادرِ روزگار ذخیرہ کس قدر وسعت اختیار کر جائے گا۔ لیکن یہ آغاز ہے، مرحوم کا کلام رفتہ رفتہ مختلف زبانوں میں منتقل ہو رہا ہے، جب یہ عمل پایۂ اتمام پر پہنچ جائے گا، یعنی دنیا کی تمام ملتوں اور قوموں کے لیے مرحوم کے ارشادات و افادات سے بالواسطہ نہیں، بلاواسطہ فیض یاب ہونے کا سر و سامان مہیا ہو جائے گا تو کون کہہ سکتا ہے، آیندہ کیا کچھ لکھا جائے گا اور صوری و معنوی حیثیت سے اس کی مقدار کس درجے پر پہنچ جائے گی؟ تاہم یقین ہے کہ پیشِ نظر کتاب جیسا کوئی دوسرا مرقع شاید ہی تیار ہو سکے، جس میں خالص علم و فضل اور فلسفہ و حکمت کے اسرار و رموز تو شاید نہ مل سکیں، تاہم ایک معصوم بچی نے بچپن سے اپنے بلند منزلت عمِّ محترم کے پاس رہ کر جو کچھ دیکھا، جزواً جزواً محفوظ رکھا اور اسے انتہائی بے ساختگی سے بیان کر دیا۔ اس میں

بعض دوسرے افراد خاندان کے ذکر و روایات سے مرحوم کی ایک ایسی تصویر تیار ہو گئی جس سے مکمل تر تصویر تیار کرنے کے لیے مزید گھریلو سرو سامان دستیاب ہونے کی بظاہر کوئی امید نہیں۔

اقبال، زندگی کے کسی بھی دائرے میں وضع و ساخت کے کبھی پابند نہ ہوئے۔ ان کی فطرت کو وضع و ساخت سے کوئی مناسبت نہ تھی اور اس کی مثالیں کتاب میں جا بجا ملتی ہیں، مثلاً "فالودہ" یعنی پکے اور جمائے ہوئے نشاستے کے باریک قتلے ایک مشہور خورش ہے۔ پنجاب کے شہری لوگ اسے "فالودہ" ہی کہتے ہیں لیکن ٹھیٹھ پنجابی میں اس کا تلفظ "پھلودہ" ہے۔ اقبال نے اپنی والدہ ماجدہ کی زبان سے یہی تلفظ سنا اور وہ پنجابی میں باتیں کرتے تھے تو اس خورش کو "پھلودہ" ہی کہتے تھے۔ دلیل دیتے کہ:

"میری ماں نے تو مجھے یہی سکھایا ہے۔ میں اپنی ماں کی تعلیم فراموش نہیں کر سکتا۔" (ص ۳۳)

گھریلو زندگی کا دائرہ ایسا ہے جس میں بڑی سے بڑی شخصیت کے متعلق تکلف و تصنع کا وہم بھی دل میں نہیں گزر سکتا، لہٰذا اس کتاب میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ فی الجملہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور واقعیت کے عین مطابق ہے۔ اقبال کی بے ساختگی اور ہر قسم کے تکلف سے مبرا ہونے کی جیسی تصویریں یہاں ملتی ہیں وہ اور کہاں ملیں گی؟

(۵)

کتاب کے چند پہلو بطورِ خاص مستحق توجہ ہیں اور وہ کسی خاص شرح و تفصیل کے محتاج نہیں۔ مثلاً:

۱۔ ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کا درجہ بطور مفکر یا بطور داعیِ حق نہیں بلکہ محض بطور انسان کیا تھا اور اس میں محبوبیت کی کتنی فراوانی تھی۔

۲۔ اس میں مرحوم کے حالات ابتدا سے آخری دور تک زیادہ تر اہلِ خاندان کی زبان سے

بیان ہوئے ہیں ، جن سے زیادہ مستند بیان اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اس میں بیشتر اقربا کے صحیح حالات آ گئے ہیں لہذا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرحوم نے کس فضا میں تربیت پائی۔ فکر و نظر کے جو خاص جوہر قدرت نے ان میں ودیعت کیے تھے ، وہ کس ماحول میں جِلا پا کر عالمگیر روشنی کا مصدر بنے۔

۴۔ اس میں بعض نظموں کی مستند تاریخیں مل سکتی ہیں ، مثلاً مشہور نظم "بچہ اور شمع" کن حالات میں اور کس سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔

۵۔ سکول اور کالج کے زمانے میں مرحوم نے جو کتابیں بطور نصاب پڑھی تھیں ، ان پر جا بجا تحریریں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کتابیں یا ان میں سے اکثر محفوظ رہیں۔ کتاب کا ایک باب ان کتابوں کے لیے وقف ہے جس کا عنوان " نوادر" رکھا گیا ہے۔

۶۔ مرحوم کے انتقال سے کچھ عرصہ بعد ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک مجمل سی تحریر شیخ عطا محمد مرحوم نے روزنامہ " انقلاب" میں چھپوا دی تھی ، یعنی ۱۸۷۳ء۔ یہی تاریخ عموماً مستند سمجھی جاتی رہی۔ پھر کہا گیا کہ ۱۸۷۶ء صحیح تاریخِ ولادت ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں پوری چھان بین کے بعد طے کر دیا گیا ہے کہ صحیح تاریخِ ولادت ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ عیسوی تھی (۲۸۔ ذیقعدہ ۱۲۹۰ ہجری اور دن غالباً دوشنبہ)۔ اس مسئلے کے لیے بھی کتاب کا ایک مستقل باب وقف ہے جس میں ہر اعتبار سے محکم دلائل پیش کر دیئے گئے ہیں۔ یقین ہے کہ اس مسئلے پر مزید بحث یا گفتگو کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔

(۶)

اب کتاب کے بعض ان اندراجات کا ذکر مجملاً کروں گا جو کسی قدر تشریح کے متقاضی ہیں :

۱۔ یہ مسلّم ہے کہ علامہ مرحوم نے ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور ۱۸۷۳ء کو

تاریخ ولادت مان لیا جائے تو میٹرک پاس کرنے کے وقت ان کی عمر کم و بیش بیس۲۰ سال کی تھی۔ وہ بڑے ہی ذہین اور محنتی تھے، یہ امر یقیناً تعجب انگیز سمجھا جا سکتا ہے کہ جو امتحان عموماً پندرہ سولہ سال کی عمر میں پاس کر لیا جاتا تھا، وہ کس وجہ سے بیس۲۰ سال کی عمر میں پاس کیا؛ آیا انھوں نے کچھ مدت کے لیے تعلیم ترک کر دی تھی؛

میں مرحوم کے ابتدائی حالات کی جستجو میں دو مرتبہ سیالکوٹ گیا تھا اور ان تمام اصحاب سے ملا جن سے مرحوم کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ سیّد نذیر نیازی اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی اس سفر میں میرے ساتھ تھے۔ شمس العلماء مولانا میر حسن مرحوم کے صاحبزادے سیّد تقی شاہ نے، جو علامہ مرحوم کے ہم عصر تھے، بتایا تھا کہ ابتدا میں مرحوم کو دینی تعلیم کے لیے ایک مکتب میں بٹھا دیا گیا تھا۔ پھر ایک مرتبہ شمس العلماء مولانا میر حسن اس مکتب میں گئے تو مرحوم کو مکتب سے اٹھا کر سکول میں داخل کرا دیا۔ شمس العلماء مرحوم، علامہ مرحوم کے والد ماجد شیخ نور محمد کے دوست تھے اور ان کے فیصلے کو بہ طیب خاطر قبول کر لیا گیا۔ یوں میٹرک کے امتحان میں دو تین سال کی تاخیر ہو گئی۔

البتہ اس روایت کی توثیق اور کسی بیان سے نہ ہو سکی، کیونکہ کوئی ایسا فرد مل ہی نہ سکا جو اس حقیقت سے آگاہ ہوتا۔

۲۔ ایک مقام پر بیان کیا گیا ہے کہ علامہ مرحوم والدین کے بڑے فرمانبردار تھے:

ا۔ ان کے سامنے کبھی اونچی آواز سے گفتگو نہ کرتے تھے۔

ب۔ والدہ ماجدہ سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو سب سے پہلے بڑے پیار کے ساتھ ان سے گلے ملتے۔ وہ بھی بڑی محبت سے ان کے سر اور پیشانی کو چومتیں۔

ج۔ اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بھی بے حد احترام کرتے تھے۔ (ص: ۱۶)

اس کا روشن ترین ثبوت تو وہ نظم ہے جو والدہ مرحومہ کی وفات پر کہی گئی۔ ایسی

نظم شاید ہی کسی شاعر نے کسی زبان میں والدہ کے متعلق کہی ہو۔ پھر اس کے مختلف اشعار بھی مندرجہ بالا بیان کی شہادت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً:

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا، تُو چل بسی

اس سلسلے میں اپنے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وہ جواں، قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہُوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے ناآشنا، صبح و مسا روتا ہے وہ

بھائی کے خاص احترام کا ثبوت مشہور شاعر تلوک چند محرومؔ کے ایک بیان سے بھی ہوتا ہے، محرومؔ ایک مرتبہ لاہور آئے تھے تو علامہ مرحوم سے بھی ملے تھے اور یہ غالباً ان کی پہلی ملاقات تھی۔ باتیں کرتے کرتے محرومؔ نے درخواست کی کہ میں آپ کا کلام آپ کی زبان مبارک سے سننے کا آرزومند ہوں۔ فرمایا:

"میرے بھائی صاحب مجھ سے ملنے کے لیئے آئے ہوئے ہیں اور ساتھ کے کمرے میں تشریف فرما ہیں اور میں پاسِ ادب سے ان کی موجودگی میں کلام نہیں سنا سکتا۔"

(۷)

۳۔ ایک مقام پر حضرت علامہ مرحوم کے متعلق لکھا ہے:

"وہ فطرۃً بڑے تساہل پسند تھے۔" (ص: ۲۳)

واضح رہے کہ یہاں "تساہل پسندی" سے مقصود غفلت و سہل انگاری نہیں۔ مقصود محض یہ ہے کہ انھیں زیادہ نقل و حرکت پسند نہ تھی۔ اسی لیے متذکرہ بالا فقرے کی تشریح ان الفاظ میں کی:

"چارپائی پر نیم دراز یا گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے رہنے کے بڑے دلدادہ تھے۔" (ص: ۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم کی طبیعت ابتدا ہی سے غور و فکر میں انہماک و استغراق کی طرف مائل تھی۔ رفتہ رفتہ یہ انہماک بڑھتا گیا اور نقل و حرکت بارِ خاطر ہونے لگی، حالانکہ

بالکل ابتدائی دور میں وُہ پہلوانوں کے اکھاڑوں میں جاتے اور ورزش کرتے تھے۔ ایک زمانے میں سیر بھی باقاعدہ کرتے رہے تھے۔ پھر نقل و حرکت کم ہوتی گئی۔ اس وجہ سے ان کے جسم کا نچلا حصّہ کمزور ہو گیا تھا، اگرچہ عام ملاقاتیوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ بیٹھنے کے لیے جو کرسی استعمال فرماتے تھے، وہ بھی ایک حد تک آرام کرسی ہی تھی۔ آپ اسے "نیم آرام کرسی" سمجھ لیں۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں تھے تو عموماً برآمدے میں بیٹھتے۔ گرمیوں میں تپش کے باعث برآمدے میں بیٹھنا دشوار ہو جاتا تو ڈرائنگ روم میں صوفے پر جا بیٹھتے۔ سردیاں آتیں تو سرِ شام ہی خواب گاہ کے پلنگ پر تشریف فرما ہو جاتے۔ دُھسّا کندھوں پر ہوتا، لحاف سینے تک اوڑھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لیتے۔

مرحوم کی نشست کا معاملہ بھی عجیب تھا، ان کے ارشادات کا سلسلہ جاری ہوتا تو وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ رہتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک روز مجھے فرصت تھی اور میں صبح ہی ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے وسیع برآمدے میں باتیں شروع ہو گئیں۔ جب میں اجازت لے کر اٹھا تو گیارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ اس اثنا میں کرسیاں تو اِدھر اُدھر کھسکاتے رہے، لیکن اٹھے نہیں اور اتفاق یہ کہ اس روز کوئی ملاقاتی بھی صحبت میں خلل انداز نہ ہوا۔

(۸)

دسمبر ۱۹۳۱ء میں وُہ لندن سے روما، نیپلز اور قاہرہ ٹھہرتے ہوئے یروشلم گئے تھے، جہاں سید امین الحسینی مفتیِ اعظم فلسطین نے مؤتمر اسلامی کے انعقاد کا انتظام کیا تھا۔ مجھے بھی ہم رکابی کا شرف حاصل تھا۔ ہمیں جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا، وُہ مقام مؤتمر سے بہت قریب تھا۔ ایک روز صدرِ بلدیۂ یروشلم کی طرف سے ایک ہوٹل میں عصرانے کا انتظام کیا گیا، جو ہماری قیام گاہ سے قریباً دو فرلانگ یا اس سے کسی قدر زیادہ فاصلے پر تھا۔ ہم موٹر میں وہاں پہنچے۔ چائے پی چکنے کے بعد شرکائے عصرانہ ایک دم

باہر نکلے اور ہجوم کا سا سماں پیدا کر دیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا: "ان سب کو نکل جانے دو، پھر ہم نکلیں گے۔"

جب باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک بھی موٹر موجود نہیں۔ جو لوگ پہلے نکلے تھے، موٹروں میں سوار ہو کر اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف چلے گئے، لہٰذا ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی موٹر کی واپسی کا انتظار کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ "ہماری قیام گاہ کچھ دور تو ہے نہیں، کیوں نہ ٹہلتے ٹہلتے پیدل وہاں پہنچ جائیں؟" فرمایا: "ٹھیک ہے، چلو!" لیکن پانچ دس قدم چل کر رُک گئے اور فرمایا: "مہر صاحب! ہم تھک جائیں گے۔" حسنِ اتفاق سے اسی وقت ایک موٹر آگئی اور ہم اس میں سوار ہو کر قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

غرض ان کے لیے دو فرلانگ بھی چلنا مشکل تھا اور یہ فکری انہماک میں نقل و حرکت سے گریز ہی کا نتیجہ تھا۔ فکری انہماک نہ ہوتا تو وہ نظمیں کیوں کر کہی جاتیں جن کے لیے قدرت نے ان کی فطرت میں خاص صلاحیت ودیعت کی تھی اور جن کی بدولت وہ عالمی شخصیتوں کی مجلس میں ایک ممتاز درجے پر فائز ہوئے۔

میرے سامنے اور بھی واقعات ہیں لیکن اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا۔

(۹)

سادگی بھی ان کی ایک ایسی خصوصیت تھی جس کی کوئی مثال مجھے ان کے درجے یا اس سے کم مرتبے کے کسی فرد میں نہ مل سکی، حالانکہ میرے سامنے ترکِ موالات کے دور میں بعض بلند پایہ اصحاب نے انتہائی سادگی اختیار کر لی تھی، مثلاً مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم، سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو وغیرہ۔ البتہ مولانا حسرت موہانی مرحوم ابتدا ہی میں سادگی کی اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں کوئی دوسرا نہ پہنچ سکا۔

گرمیوں کا موسم ہوتا تو علامہ مرحوم گھر میں سفید قمیص اور دھوتی پہنتے، سردیاں آتیں تو دُھسّا اوڑھ لیتے۔ البتہ ہائی کورٹ جانا ہوتا یا کسی خاص تقریب میں شمول ناگزیر ہو جاتا

تو سُوٹ پہن لیتے۔ شلوار کے ساتھ چھوٹا کوٹ بھی پہنا اور شیروانی بھی۔ سر پہ ترکی ٹوپی رکھتے تھے۔ جب ترکی ٹوپیاں ملنی مشکل ہوگئیں تو قرہ قلی نما سیاہ ٹوپی پسند فرمالی۔ کبھی کبھی پشاوری لنگی اور کلاہ بھی استعمال فرماتے۔ تکلف کا لباس کبھی نہ پہنا، تکلف کے تقاضوں سے وہ بالطبع نفور تھے۔

میں نے سنا کہ اواسط عمر میں ایک درزی کو ناپ دے دیا تھا، پھر کبھی ناپ نہ دیا۔ اسی سے سوٹ سلواتے رہے۔ "ٹرائی" کے لیے کبھی درزی کی دکان پر نہ گئے۔ درزی خود ہی پہلے ناپ کو سامنے رکھ کر اندازے کے مطابق خفیف سا ردّ و بدل کر دیتا۔ مرحوم بے تکلف وہی سوٹ پہنتے رہتے۔ کبھی یہ نہ دیکھا کہ سُوٹ عین جسم کے مطابق ہے یا نہیں یا اس میں کہیں کم یا زیادہ ڈھیل ہے، جسے درست ہو جانا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کا جسم ایسا بنایا تھا کہ کتنا ہی سادہ لباس پہنتے، اس میں زیبائش کی ایک خاص شان نمودار ہو جاتی۔ یہ حقیقت ان کی مختلف تصویریں دیکھ لینے سے آشکارا ہو سکتی ہے۔

ان کی یہ سادگی بھی سراسر فطری تھی۔ وہ لباس کو تن پوشی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جو لباس وقت اور ماحول کے مطابق یہ تقاضا پورا کر سکتا، اس پہ مطمئن رہتے تھے۔ ایسے معاملات میں مین میکھ نکالنے سے ان کی طبیعت اِبا کرتی تھی۔

حد یہ ہے کہ اپنے لیے بازار سے کپڑا خریدنے بھی کبھی نہ گئے۔ ممکن ہے کچھ نمونے دیکھ کر کبھی کوئی کپڑا پسند کر لیا ہو، ورنہ منشی طاہر دین مرحوم اور علی بخش مرحوم ہی ان کی ضرورت کا کپڑا خرید لاتے یا والدۂ جاوید کوئی کپڑا پسند کر کے ضرورت کی چیزیں بنوا دیتیں۔

کتاب میں ایک واقعہ درج ہے کہ والدۂ جاوید کے بھائی عبدالغنی مرحوم کی شادی پر علامہ مرحوم کے لیے جو "رسمی جوڑا" دیا گیا اس میں "بوسکی" کی ایک قمیص

بھی تھی، جسے اس زمانے میں خاص تحفہ سمجھا جاتا تھا۔ انھیں جب یہ قمیص دکھائی گئی اور کہا گیا کہ یہ "بوسکی" ہے تو فرمایا:

"اس میں کوئی خاص بات تو نظر نہیں آتی۔" (ص: ۲۳)

اسے بھی احساس کی فطری سادگی ہی کا ایک کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ کپڑوں کی قسموں یا خوبیوں یا پسندیدگیِ عوام سے انھیں کبھی کوئی سروکار نہ رہا۔ ان کے لیے اتنا کافی تھا کہ لباس وقت کی ضرورت پوری کر رہا ہے۔

(۱۰)

ان کے بعض معاملات بڑے ہی عجیب تھے، وقتاً فوقتاً گردے یا نقرس کا درد ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ گرمیوں میں گُردے کی تکلیف ہوئی اور وُہ کئی روز بیمار رہے۔ میں دوپہر کے وقت دفتر جاتے جاتے مزاج پُرسی کے لیے حاضرِ خدمت ہوا۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں ان کی خواب گاہ کے پیچھے ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ شمالی جانب تھا۔ اس میں تپش بہت کم ہوتی تھی۔ فرش پر خوب پانی ڈلوا کر اس کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے خاموش بیٹھ کر ان کے چہرہ مبارک پر نظر جمالی۔ ہم لوگ عموماً ان کی نگاہوں سے حالات کا اندازہ کرنے کے عادی تھے۔ اس اثنا میں ایک اور صاحب بھی عیادت کے لیے آ گئے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ یکایک حضرت مرحوم نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"مہر صاحب! تکلیف انسان پر اس کے نفس کی طرف سے آتی ہے یا اللہ کی طرف سے؟"

میں جواب میں حدیث جبریلؑ سے وُہ الفاظ دہرانا چاہتا تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے سوال پر فرمائے تھے، یعنی:

"ما المسئول باعلم من السائل"

"جس سے پوچھا گیا ہے اس کا علم پوچھنے والے سے زیادہ نہیں"۔ لیکن میں کچھ کہنے بھی

نہیں پایا تھا کہ جو صاحب میرے پاس بیٹھے تھے، بول اٹھے! "ڈاکٹر صاحب! سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔"

یہ سنتے ہی ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی، پہلے چیخ نکلی، پھر روتے روتے کہتے جاتے کہ "اگر یہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے تو میری توبہ، میری توبہ، میری توبہ، میں نے کیوں شکوہ کیا؟" طبیعت کے معمول پر آنے پر پانچ سات منٹ صرف ہو گئے۔

سوال یہ نہیں کہ عیادت کے لیے آنے والے صاحب نے جو کچھ فرمایا، وہ درست تھا یا نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ ہر بات کا ایک مقام اور محل ہوتا ہے اور بیمار کے تصوّرات و احساسات کا صحیح اندازہ کیے بغیر ایسی بات کہہ دینا جو باعثِ راحت و اطمینان نہیں، باعث زحمت و پریشانی ہو، قطعاً مناسب نہ تھا۔

(۱۱)

ان کی نظر ہمیشہ بنیادی حقایق پر رہتی تھی۔ کتاب میں ایک واقعہ درج ہے کہ جب وہ انارکلی میں رہتے تھے تو ایک روز شدید آندھی آئی۔ تیسری منزل پر ایک دیوار گر گئی۔ ان کی برادر زادی، جن کی بیشتر روایات پر یہ کتاب مشتمل ہے، بہت چھوٹی تھی۔ دیوار گر جانے پر اسے خیال ہوا کہ اسے از سرِ نو تعمیر کیا جائے گا۔ وہ سخت پریشان ہو کر بولی کہ "ہائے! اس میں میرے چچا کے بہت سے روپے صرف ہوں گے۔" حالانکہ مکان کرایے کا تھا اور شکست و ریخت کی مرمت کا ذمہ دار مالک مکان تھا۔ یہ واقعہ حضرت علامہ نے سُنا تو فرمایا:

> "بچی کے جذبے کی داد دینی چاہیے، اتنی چھوٹی سی عمر میں اسے دوسرے کی تکلیف کا کتنا احساس ہے کہ دیوار گرنے کے ساتھ ایک دم اسے یہی خیال آیا کہ مرمت پر اب اس کے چچا کے روپے خرچ ہوں گے۔ میری یہ بات یاد رکھیے کہ یہ بچی بڑی ہو کر بڑے حساس دل کی مالک ہو گی اور کسی دوسرے کی معمولی سی تکلیف بھی اسے بے چین کر دیا کرے گی۔" (ص: ۱۵)

کتاب میں ایک واقعہ ایسا بھی ہے جو میرے علم کی حد تک پہلی مرتبہ منظر عام پر آ رہا ہے، یعنی حضرت علامہ مرحوم کا فی البدیہہ پنجابی شعر کہنا۔

جاوید کو بچپن میں "بتا" کہہ کر پکارتے تھے اور اس کے کھیلنے کے لیے بکری کا ایک بچّہ بھی رکھ لیا گیا تھا، جسے وہ بعض اوقات لیے لیے پھرتا تھا۔ ایک روز جاوید بکری کے بچّے سے کھیل رہا تھا۔ حضرت مرحوم زنانے میں گئے تو ایک چارپائی پر بیٹھ کر جاوید کا کھیلنا بھی دیکھ رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ والدۂ جاوید کو خدا جانے یکایک کیا خیال آیا کہ حضرت مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ نے بے شمار شعر کہے، لیکن جاوید کے متعلق کبھی کچھ نہ کہا۔" حضرت نے فرمایا: "یہ کون سا مشکل کام ہے۔ لو ابھی کہہ دیتے ہیں۔" پنجابی میں چند شعر کہہ دیے:

اک سی بتا بکری والا
ہتھ وچ رکھدا ڈنڈا
نانی جو اوہنوں پھڑن لگی
نیا مار چھپنڈا

بھابی بتا بکری والا
نالے کھاندا توس تے انڈا
نالے کھاندا حلوا منڈا

بھابی بتا بکری والا

(ص: ۵)

شعر ایسے ہیں کہ محض فرمائش ہی پوری نہ ہوئی بلکہ جو بھی انھیں پڑھے گا یا سنے گا بے اختیار ہنس پڑے گا اور حد درجہ مسرت کا اظہار کرے گا۔

یہ مرحوم کی حد درجہ خوشگوار گھریلو زندگی کا بھی ایک نہایت دل آویز مرقع ہے۔ وہ

عمر بھر محض اپنی ملت کو نہیں، پُورے عالم انسانیت کو بنیادی حقایقِ حیات کی دعوت دیتے رہے اور اس سلسلے میں ان کے افکارِ عالیہ کے تمام مجموعے حقیقی بصیرت و موعظت کی بیش بہا فکری ثروت کے گنجینے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے جو وظیفہ ان کے سپرد کیا تھا، اسے جس اعلیٰ پیمانے پر انھوں نے پورا کیا، اس کی گواہی دنیا کے ارباب فکر و نظر ہی نہیں، عوام بھی دے رہے ہیں، لیکن دیکھیے ایک سرسری فرمایش انھیں کس طرح انتہائی بلندیوں سے اتار کر عام سطح پر لے آئی اور اس سطح پر بھی ان کی شانِ محبوبیت ویسے ہی جلوہ افروز ہوئی، جیسے وہ انتہائی بلندیوں پر جلوہ افروز رہی۔

غرض مرحوم ہر رنگ اور ہر حال میں محبوبیت کا ایک بدیع پیکر تھے اور محبوبیت ہی کو ان کے اوصاف و خصائل میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کی تعلیمات ہی نہیں بلکہ ذاتی اوصاف و خصائل سے بھی بوجہ احسن بہرہ مند ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

یہ سرسری اشارے میں نے اپنے خیال کے مطابق اس لیے ضروری سمجھے کہ شاید یہ اصل کتاب کے مطالعے میں ایک حد تک معاون و رفیق بن سکیں، ورنہ اصل کتاب اپنی سادگی اور بے ساختگی میں کسی اعانت و رفاقت کی طلب گار معلوم نہیں ہوتی۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین۔

پیش لفظ "اقبال درونِ خانہ"

اقبالؒ ــ روزنامچہ مہر میں

۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک قریباً ہر روز آن کی بابرکت خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتی تھی۔ عموماً چار پانچ گھنٹے ان کے پاس گزرتے تھے۔ بعض اوقات متواتر گیارہ گیارہ گھنٹے بھی گزارے۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں باقاعدہ روزنامچہ لکھتا رہا جس میں ان کے سارے ارشادات خلاصۃً جمع کر لیتا تھا۔

(روزنامہ امروز۔ بیادگارِ علامہ اقبالؒ مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء
ماخوذ علامہ اقبالؒ کے بعض مکاتیب از مولانا غلام رسول مہر)

ـــه حضرت علامہ اقبالؒ

۱۳ جولائی ۲۵ سنہ

پانچ اور چھ کے درمیان ڈاکٹر اقبال سے ملنے گیا۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دو غزلیں سنائیں جو اپنے مقام پر درج ہیں۔ چونکہ مغرب کے وقت سے تنہائی میسّر آ گئی تھی اس لیے صاحب موصوف سے جی بھر کر مکالمات ہوئے۔ جن کے ضمن میں افلاطون کا فلسفہ، گاندھی کی تحریک، احمد رخصت سے ملاقات وغیرہ مسائل درمیان میں آئے۔ افلاطون کے متعلق فرمایا کہ وہ فلسفیانہ مُشکلات کے پیش نظر شر کے عدم کا قائل ہو گیا تھا۔ اگر اس کا وجود مان لیتا تو مصیبت یہ تھی کہ یا تو اسے ثنویوں کی طرح خُدا کا مدّ مقابل مانتا یا اسے مخلوقات سمجھتا۔ لیکن یہ دونوں صورتیں خُدا کی ذات کے لیے نامناسب تھیں۔ لہٰذا وُہ عدم شر کا قائل ہو گیا۔ گاندھی کی تحریک کے متعلق ایک فاضلہ پارسی خاتون کے ساتھ مذاکرہ کا ذکر آیا۔ خاتون مذکورہ گاندھی کی تعلیمات کی شیدائی تھی۔ اس کا رد از رُوئے مذہب پارسیت۔ بعد ازاں از رُوئے منطق۔ عدم تشدّد کے بہترین مظہر۔ حضرت مسیح کی تعلیم گال پر طمانچہ کے متعلق اس سے ثبوت یہ کہ یہ شر سے ترک موالات نہیں بلکہ اس کے ساتھ موالات ہے۔ خاتون کا عاجزانہ اعتراف۔ احمد رخصت کو زوال اسلام کی علّت دو حرفوں میں بتائی۔ SAINT WORSHIPING اس کی تشریح اور اس کے نتائج۔ عالم اسلام کے دوسرے بڑے مبصروں نے بتایا کہ اصل علّتِ زوال بحریات سے مسلمانوں کی بے توجہی تھی۔

اقبال کا اپنا تذکرہ اپنی والدہ کے اتقا کا واقعہ۔ والد ڈپٹی صاحب وزیر علی کے ملازم تھے اور ڈپٹی صاحب پر رشوت کا شبہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش سے پیشتر حلف کہ ان کے والد صاحب کی آمدنی سے کوئی شے بچّے کے منہ میں نہ جانے دُوں گی۔ دو سال تک خود والد صاحب کی آمدنی سے استفادہ سے احتراز۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو دس سال تک اس سے محفوظ رکھنا۔ یہاں تک کہ والد صاحب نے ڈپٹی صاحب کی ملازمت ترک کر دی۔

بھائی صاحب کی ملازمت۔ عُمر میں سولہ سال بڑے۔ پٹواری۔ ضلع میں۔ فوج میں رنگروٹ کا امتحان پاس کیا۔ اوورسیر۔ لاکھوں روپے کمائے۔

والد صاحب کے دینی و مذہبی خیالات۔ چچا صاحب قانون میں بڑے طاق تھے۔ روپڑ کے سردار کے ریڈر۔ شراب کی عادت۔ بیمار ہو کر سیالکوٹ میں آئے۔ انتقال۔ ان کے بچّوں کی پرداخت ڈاکٹر صاحب کے والد کے ذمّہ۔ نوکری قلیل۔ خرچہ زیادہ۔ تنگی۔ ڈپٹی صاحب کے ہاں سے مٹھائی ملنا۔ راستے میں کُتّے کو کھلانا۔ ایک شخص کا چلتے چلتے کہنا کہ تمھاری یہ خدمت قبول ہو گئی۔ اس کے بعد ترقی۔ دکان کلاہ دوزی۔ چوہدری عبدالغنی بیرسٹر کے دادا کا واقعہ۔ لاہور کے ایک غریب آدمی کا چند سال میں رئیس بننا۔ ایک پورشین لیڈی کے ذریعہ سے۔ تین لاکھ روپیہ کمانا۔ میری ملازمت، ذرائع آمدنی اور دوسری باتیں۔ سوا دس بجے رات کے قریب واپسی۔

۲۴/جولائی ۲۵ء۔

آل پارٹیز کانفرنس کے سلسلے میں جمعیۃ العلماؔ اور علمائے دیوبند نے قادیانیوں سے مقاطعہ کا اعلان کرتے ہوئے کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ آج میں نے اس مسئلہ کے متعلق مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلما کو چھ صفحے کا خط لکھا، جس میں جمعیۃ اور علمائے دیوبند کے فیصلے سے شدید اختلاف کیا۔ اس خط کی نقل محفوظ رکھ لی گئی ہے۔

جمعیت خلافت نے وفد کے سلسلے میں ابتداً "زمیندار" کی رائے پر عمل نہ کیا انجام کار "زمیندار" کی رائے صحیح ثابت ہوئی اور جو پیش گوئیاں اس نے کی تھیں وُہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئیں۔

شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ بہت سی باتیں ہوئیں لیکن خاص گفتگو کا موقع نہ آیا۔ جو شعر سنائے وہ دوسری کتاب میں درج کر لیے گئے۔ عام باتیں اہل زمانہ

کی چالاکی۔ جلب زر کے متعلق ہوتی رہیں۔ ساڑھے دس بجے کے قریب واپس آیا۔

---

۱۵ اگست

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات۔ طویل گفتگو۔ تحریک خلافت۔ مستقبل اسلام۔ تعلقات ہنود و مسلمین۔ اپنے والد صاحب کے واقعات۔ والدہ کا واقعہ۔ مسئلہ طلاق۔ بھائی کا اپنی پہلی بیوی کو خاص وجوہ کی بنا پر طلاق دینا۔ اس کی آمد و رفت۔ والدہ کی خاطر و مدارات، طلاق کی حقیقت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اشعار جو دوسری کتاب میں درج کر لیے گئے ہیں۔

۲۴ جولائی سنہ ۲۵ء

یہ ضروری اطلاع کہ میری زندگی میں ایک عظیم الشان تغیّر پیدا ہو رہا ہے۔ پہلے ایک تغیّر ہوا تھا، جس کی تاریخ ایم اے کے زمانے سے شروع ہوئی ہے یہ دماغی دہریت تھی جو ولایت میں جا کر اوج کمال تک پہنچی۔ ولایت کے بعد اس میں ردِّ عمل۔ اب دوسرا تغیر قول سے عمل کی طرف آمد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرما دیا میری اس بات کو یاد رکھو اگر میری زندگی میں یکایک کوئی عظیم الشان تغیّر ہوا تو اس پر متعجّب نہ۔

۱۵ اگست۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات۔ باتیں۔ شعر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ دنیا کے اعاظم رجال۔ کسی نے اپنے کام کا نتیجہ زندگی میں نہیں دیکھا۔ رسول اللہ کے کام کی شان زندگی میں نتائج۔ الیوم اکملت لکم دینکم کی تفسیر۔

---

۲۵ اگست۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات۔ مختلف باتیں۔ شعر۔ باتیں۔ لیڈروں کے متعلق گفتگو۔ مذہب۔ اسلام کا مستقبل۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت۔ والد صاحب کی حالت۔ رسول اللہ کے نام پر رقّت۔ ایک بکی کا واقعہ۔ رونا۔ ڈاکٹر صاحب کا علّت پوچھنا۔ فرمانا بڑے

ہو گئے تو بتائی جائے گی۔ بی اے کا امتحان۔ کامیابی کا تار۔ علّت کی تشریح۔ ولایت کا واقعہ۔ ایک مسلم کا مسیحی ہونا۔ پردہ اور رسُول کی محبّت کی پابندی۔ ہندوستان کی سیاسیات۔ ساڑھے دس بجے شب کے واپسی۔

---

۷ ستمبر ۲۵ء۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات مولوی ظفر علی خاں کی معیت میں اور سفرِ حجاز کے متعلّق تقریباً ایک گھنٹہ تک گفتگو۔

۱۴ ستمبر ۲۵ء

ڈاکٹر صاحب نے بُلایا۔ قاضی عزیز الدین کے مضمون کے متعلق ہدایات۔ دو شعر سُنائے دو گھنٹے کے بعد واپسی۔

۱۵ ستمبر ۲۵ء۔

مولوی ظفر علی خان کی معیّت میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات۔ مختلف باتیں آٹھ بجے کے قریب خلوت۔ شعر "مشرق و مغرب" کی نظم سُنانے کے لیے کتاب نکالی۔ برآمدے کی بجلی کی روشنی میں کھڑے ہو کر تین نظمیں سنائیں۔ مولوی احمد دین امرتسری کی خواہش ملاقات کا ذکر۔ جواب مجھ سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ استفسار طلبِ قرآنی مسائل۔ مسئلہ تقا۔ مسئلہ نجات و تقدیر انسانی۔ مسئلہ رُوح و امر۔ سورہ نون کی آیت جس میں دو دفعہ مارنے اور دو دفعہ زندہ کرنے کا ذکر ہے۔ مسئلہ نجات پر مفصّل بحث۔ عیسائیت کا اصول کفّارہ۔ بُدھ مذہب کا اصول نروان۔ زرتشتیت کا اصول ثنویت۔ یہودیت کا اصول۔ اسلام قرآن نے پرسنل سیلف پر خاص زور دیا ہے۔ نیوسائیکالوجی۔ ریلیجن اینڈ نیوسائیکالوجی۔ تصوّف۔ تجرد کے اثرات اور ہسٹیریا۔ اسلام کے اصول مناکحت۔ تعدد ازدواج۔ سہولتِ طلاق۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور منصور کے علاج کی تدبیر۔ ابنِ عربی۔ زور نبوت و ولایت۔ تشریح از

نیوسائیکالوجی۔ روحانیت کا دور۔ ولایت نیچے سے اور نبوت اوپر سے۔ رُوحانیت میں فوق و تحت کے لیے رُومی کا شعر۔ گوئٹے کا خیال۔ ستاروں سے تخاطب

Is There up and down in your dominion also.

جذبات و عقل - INTELLECT AND EMOTION

تحت و فوق کے متعلق آئین سٹائن کے خیالات۔ یہ اصلاحات اضافی ہیں۔ ویگا۔ روشن ترین ستارہ۔ نظام شمسی اور ویگا کی طرف جانے کے متعلق فلکیوں کے خیالات۔

ویگا دیکھنے کا ذکر گورنمنٹ کالج کی رصدگاہ میں۔

پال گھاٹ کے اچھوت۔ دس بجے کے قریب واپسی۔

۱۹ر ستمبر

دس بجے صبح میکش کی معیت میں۔ سفر حجاز کے متعلق باتیں۔ میں نے عرض کیا کہ دماغ اگرچہ ایسی باتوں کو صحیح نہیں سمجھتا لیکن دل کی یہ کیفیت ہے کہ عرب پہنچتے ہی وہاں کی خاک پاک کے ذرّے ذرّے کو چوموں اور بوسے دیتا رہوں تا آنکہ جان نکل جائے۔ اس پر جوش محبت رسول میں چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔

اپنے عزم سیاحت۔ دنیائے اسلام کے متعلق باتیں۔ تین آدمی ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب اور چوہدری صاحب (چوہدری محمد حسین) اور راقم الحروف۔ چوہدری صاحب سفرنامہ لکھیں گے۔ کابل میں بین الملی یونیورسٹی قائم کرنے کی سکیم۔

۲۳ر ستمبر

۲۱ر کی شام کو علی بخش یہ اطلاع کرنے کے لیے آیا تھا کہ امرتسر والے صاحب آئے ہوئے ہیں لیکن چونکہ میں گھر پر موجود نہ تھا اس لیے وہ ناکام واپس گیا۔ دس بجے میں واپس آیا تو حال معلوم ہُوا۔ اس وقت جانا غیر مستحسن سا معلوم ہوا۔ ۲۳ر کی شام کو میں تیار تھا کہ پھر علی بخش

آیا وہاں گیا۔ مختلف باتیں۔ عزم سیاحت دنیائے اسلام کا ذکر۔ مجھے فرمان کہ موجودہ عزم روانگی حجاز کو ملتوی کر دو اور میرے ساتھ چلو لیکن چونکہ یہ جلوت تھی۔ اس لیے بات وہیں ختم ہو گئی۔ خلوت۔ چوہدری محمد حسین اور راقم الحروف۔ شعر عزم سیاحت، سکیم۔ دو آدمی جائیں۔ بہ نفسِ نفیس اور راقم الحروف۔ تجاویز و تخمینہ مصارف۔ بحث غور و فکر مزید کے لیے التوا۔ ارشاد کہ سفر کے مصارف۔ وقت، وسائل حمل و نقل اور موزوں مواسم کے متعلق تحقیق کرو۔ منازل سفر۔ کابل۔ غزنی، سمرقند، بخارا، مرو، شیراز، اصفہان اور متعلقات، بغداد، کربلا، انگورہ و متعلقات، قسطنطنیہ، قاہرہ، فلسطین، مدینہ، مکہ۔ مختلف باتیں۔ ریاست ممدوٹ کا ذکر T.B. Z.B. کا ذکر۔ بڑی (B) کا ذکر نٹشا کے اقوال۔

Nature's roundabout way of creating four or five men قوم

اسلام کا مقصد تخلیق کائنات۔

Nature's roundabout way of creating one man - Mahammad

حدیثِ قدسی۔ لولا لما خلقت الافلاک۔

نٹشا۔ یورپ کے اتحاد کی دعوت۔ عیسائیت کو مٹا دو۔ جرمنوں سے خطاب کہ تم سب سے پہلے دہریت کے اعلان کی جرأت کرو۔ یہ خیال کہ SUPER MAN صرف یورپ سے پیدا ہوں گے۔ باقی سب قومیں غلام رہیں گی۔

نٹشا۔ اب تک ساری کائنات انسانیت میں صرف دو سوپرمین پیدا ہوئے ہیں محمدؐ اور نپولین۔

The seducer of a woman who gives her child is more loved by that woman and other women than the man who seduces a woman and does not give her a child.

ایک مؤرخ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے ایشیائی نہیں تھے جتنے کہ یورپین

تھے۔اس لیے کہ ان کا تمام آؤٹ لک یورپی ہے۔

ڈاکٹر صاحب :۔ میں رسُول اللہ کو یورپی کیا عرب بھی نہیں سمجھتا۔اس لیے کہ وُہ تو اس قسم کی قیود سے بالکل بالا ہیں۔

عرب کے متعلق باتیں۔ابن سعود۔ وائین مصنف کا قول (CALIPHATE) کہ اگر محمّد علی پاشا نجدی قوت کو ملیا میٹ نہ کرتا تو دنیا آج سے سو سال پیشتر وہی منظر دیکھتی جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں رُونما ہوا تھا۔

اسلام دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔عرب سب سے بڑی قوت ہے۔ عربوں نے بالکل بے سروسامانی کے عالم میں دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتیں تباہ کر دیں۔رُوم اور ایران۔اَب بھی اگر اسلام کی محرکانہ قوت سے کام لے کر اس خوابیدہ قوت کو کوئی بیدار کر دے تو پھر وہی منظر سامنے آجائے گا۔

عرب تمدّن کی راحتوں سے استفادہ کے بعد پھر صحرا میں جاکر قوت حاصل کر لیتا ہے اور دوسری قوموں کی طرح تباہ نہیں ہوتا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی صحیح قوّت سے کام لیا جائے اور اسے سمجھا جائے۔

نظیری کے متعلق باتیں۔غالب کے متعلق باتیں۔نظیری کا یہ شعر سُنایا :۔

از مسلماناں نظیری شد مسلمانی خراب
زین مسلمانان برائے ورد مسلمانی گریز

اس کی بے حد تعریف کی۔

ایک یورپین سے باتیں کہ تم نے میرے ہاتھ میں ایک نیا حربہ دے دیا ہے اور وُہ حربہ قومیت کا ہے۔تم پین اسلامزم سے گھبراتے ہو۔ہم اپنی تقویّت کے لیے قومیّت کی قوّت سے کام لیں گے۔یورپ کے خلاف لڑنے کی ضرورت پڑے گی تو پین اسلامزم استعمال کریں گے۔ساڑھے دس بجے واپسی۔

چوہدری سے باتیں۔ سفر۔ شادی۔ مال و دولت وغیرہ۔

---

۲۵ ستمبر

چار بجے کے قریب علی بخش آیا کہ ڈاکٹر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ شام کے بعد حاضر ہوں گا۔ آٹھ بجے گیا سفر و سیاحت کے متعلق باتیں۔ مجھ سے استفسار کہ ضروری معلومات کی نسبت اب تک کیا کیا۔ میرا جواب کہ کتابیں دیکھ رہا ہوں اور حالات دریافت کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ پندرہ روز میں سارا نقشہ مرتب کر دوں گا۔

عبدالحکیم کے متعلق باتیں۔ مولانا رُوم کا تذکرہ۔ فیہ ما فیہ۔ ماجد کے اس خیال پر کہ شمس تبریزی اور مولانا رُوم کی نسبت پیری مُریدی کی نہ تھی۔ تبصرہ بعض انسانوں کی خصوصیات ہوتی ہیں کہ ان میں بے اندازہ PASSION ہوتا ہے اور وُہ اپنا PASSION دوسروں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ یورپ والوں کا خیال کہ شمس اسماعیلیہ فرقے کے داعی تھے۔ وُہ دوسرے شمس تھے جو ملتان میں فوت ہوئے۔

اصناف شعر میں سے غزل کی خاص تعریف۔ مثنوی۔ غزل۔ رُباعی۔ مثنوی نوجوانی۔ غزل MATURE AGE رُباعی بڑھاپا۔ اوّل میں خیالات کا OVERFLOW دوسری میں خیالات پختہ۔ الفاظ کم، مطالب زیادہ۔ تیسری میں خیالات پختہ مگر ایک خیال کو WORK OUT کرنے سے طبعی نفرت بہ وجہ انحطاط قویٰ۔ اس لیے ایک ہی خیال پر اکتفا۔ پیروں کے متعلق باتیں۔

اشعار، نظیری، غالب، عرفی، نظیری میں THOUGHT اور EMOTION دونوں ہیں۔ غالب و عرفی میں THOUGHT بہت ہے EMOTION کم ہے۔

نظیری کا یہ شعر سنایا:۔

نہ ہر مغزے کہ بوید نکہت از مصر و یمن گیرد
مشام تیز باید تا نصیب از پیرہن گیرد

فرمایا کہ اس پر لکھنے کا ارادہ تھا لیکن مطلع دیکھ کر ارادہ رُخصت ہو گیا۔ اس لیے کہ ایسا مطلع لکھنا ناممکن ہے۔ گیارہ بجے کے قریب واپسی۔

---

۴ اکتوبر۔

حدیث :۔ کہ قرآن کی کوئی ترتیب نہیں ہے میکش کی وساطت سے اس کی تحقیق کا حکم۔ چھ بجے میں گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ ایک صاحب کے ساتھ یوذاسف وبدھ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں قبول کا مسئلہ ارشاد کہ :۔

SYMBOLIZATION IS THE CURSE OF HUMANITY

اگر دنیا اس سے آزاد ہو جائے تو نہیں معلوم کیا ہو جائے۔ INTELLECT TRANSFORM ہو جائے توحید۔ دنیا میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے SYMBOLIZATION کو مٹانے کی کوشش کی اگرچہ وہ کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔ اس لیے کہ اسلام کو ابھی تک پورا موقع نہیں ملا۔ حقیقت توحید پر بحث۔ انسانی فطرت SUCCESSION کی وساطت سے مطالعہ اشیا کی عادی ہے۔ جب انسان اس سطح سے بلند ہو کر HEAVENLY BODIES پر غور کرتا ہے تو SUCCESSION سے کسی قدر آزاد ہو جاتا ہے اسی طرح اگر وُہ ETERNAL کو سمجھنا چاہے تو اسے ان چیزوں سے آزاد ہونا چاہیے اس لیے کہ ETERNAL (TIMELESS) ہے۔ خُدا کا تھنکنگ، عام سلاسل وقیود نامو تی سے آزاد ہے۔ صاحبِ الہام بہ حالت وصول الہام ETERNAL جیسا بن جاتا ہے اس سلسلے میں حدیث مذکورہ بالا کی طرف اشارہ۔ قبروں کا ذکر مسلمانوں پر بُدھ مذہب کے اثرات سنٹرل ایشیا والوں نے اسلام قبول کرتے ہی اپنی قدیم پرستش گاہوں کو مسلم اولیا کے نام پر مستقل کر دیا۔ جدّہ میں حضرت حوّا کی قبر کا ذکر۔

لکھنؤ کی کانفرنس (منعقدہ عبدالباری وقدوائی) دنیائے اسلام کی گزشتہ تین سو سال

کی دوسری غلطی ہے۔ پہلی غلطی احمد شاہ ابدالی کا ہندوستان پر حملہ۔ پانی پت کے میدان میں کامیابی اور پھر یہاں سلطنت قائم نہ کرنا۔

ع۔ب A PERFECT PICTURE OF STUPIDITY
(مشیر حسین قدوائی م۔ح)
AN ILLITERATE A-B.(عبدالباری) OR AN ENGLISH KNOWING OR ENGLISH SPEAKING A.B.

لکھنؤ سے دو ملتانی پیروں کا آنا۔ حجاز کے معاملات کے متعلق تشفی کی استدعا۔ باتیں جاتے وقت اقرار کہ ہم اب سلطان ابن سعود کو برا نہیں کہیں گے۔

لکھنؤ کانفرنس کے دور رس اثرات کا اندیشہ۔ ساری دنیائے اسلام کا دو کیمپوں میں تقسیم ہو جانا۔

ع۔ب پر شعر۔

به علم غره مشو کار مے کشی دگر است
فقیه شهر گریبان و آستین آلود

F-H (فضل حسین) کی واپسی کا ذکر۔ کوئٹہ سے آمد پر H-E (گورنر) کا استقبال۔ سٹیشن سے موٹر پر بٹھا کر لانا۔ شعر۔

کسے ایں معنی نازک نہ داند جز ایاز ایں جا
کہ مہر غزنوی افزوں کند درد ایازی را

اور باتیں۔ P.F.J. کا تذکرہ۔ لوگوں کی سازشیں اور بدطینتیاں۔

A FOR AMIR JANG-H FOR HAIDRY.

سفر کے متعلق باتیں۔ حیدرآباد میں چھپے ہوئے کلام کا ذکر۔ A اور H کے خط۔ جواب۔ کلام کے متعلق فیصلہ۔ کتاب حیدرآباد سے باہر نہ آئے۔ ایک ہزار روپیہ ۱۰ر جنوری ۲۶ء تک دے دیا جائے۔

قلمی کتابوں کا ذکر جو آزر لایا۔ اسفرنگی کا کلام۔ عماد فقیہ کا دیوان۔ گلبدن بیگ وغیرہ کا کلام۔ تاریخ اعظمی۔ اشعار کا انتخاب نہایت عمدہ۔ ندیم کا شعر، جس کا ایک مصرعہ یہ ہے۔

دست فرسودہ نگاہ ہمہ کس نتواں کرد

اس میں عسس کا قافیہ بھی ہے۔ عسس نہ رہے۔ محتسب نہ رہا مگر قافیہ چل رہا ہے۔ ذوق کے شعر۔ پیش و پس جام شراب۔ عسس جامِ شراب آتش و آب و خاک و باد .....

بابا لول حج کا ذکر۔ چھٹی پشت میں۔ بارہ سال کشمیر سے باہر۔ آبا و اجداد کشمیر سے باہر آتے تھے۔ پھر واپس چلے جاتے تھے۔ دادا مستقل طور پر یہاں سکونت پذیر ہوئے پنجابی اچھی طرح نہ بول سکتے تھے۔ ساٹھ سال کی عمر میں بند ہیضے سے انتقال۔ برما میں۔ جہاں ڈاکٹر صاحب کے چچا ملازم تھے۔ لاجپت رائے ان کے بھائی کے ساتھ پڑھتے رہے۔ روپڑ میں۔

شادی کا ذکر۔ حقوق ازواج۔ تعدد ازواج۔ بحالت عدل بہترین آسائش۔ اپنا ذکر۔ عدل کی حیثیت۔ ایک بیوی کا زیور اگر کبھی اتفاق سے ہلکا بن گیا تو اسے اتنا سونا تول کر دے دیا گیا۔ اس سے دونوں کے OUTLOOK میں تغیّر باہمی محبّت، بچوں کا قبل از تولد فیصلہ۔ جاوید اب مرحومہ کا بچّہ سمجھا جاتا ہے۔ گھر کا ذکر نکاح ثانی کی اجازت۔

سفر کے متعلق باتیں۔ مصارف کے انتظام کی نسبت ذکر۔ ارشاد کہ انتظام کی صورت ہے۔ پھر آنا بتاؤں گا۔ (اس لیے کہ ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔) شعر۔ معمولی باتیں۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے واپسی۔

۶ر اکتوبر۔

ساڑھے نو بجے گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ لونگ ایج کا مضمون، متعلّق اہلِ مراکش اور پاشا کے ساتھ ملاقات۔ مراکش کے متعلّق باتیں۔ دنیائے اسلام میں کاہن۔ ارشاد کہ لاہور

میں بھی تیل کی کان ہے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ شہر بالکل اُجڑ جائے گا۔ لوگ دوسری جگہ جا بسیں گے۔ یہ بات لکھ رکھو۔ والد کی تیزی حس کا ذکر۔ زلزلہ دھرمسالہ (سنہ ۱۹۰۵ء) کے متعلق ایک گھنٹہ پیشتر خبر۔ استفسار پر بیان کہ مجھے یہ اپنی ایک خاص کیفیت سے محسوس ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ یہی تھا۔

نٹشا: ڈیموکریسی کی تعریف۔ HERD DEMOCRACY

ع کز فکر دو صد خر مغز انسانے نمے آید

حقیقی جمہوریّت اسلام کی ہے بہترین آدمی کا امارت کے لیے انتخاب۔ اس کے بعد اس سے ہر قسم کے تعرضات سے پرہیز۔ وُہ خود مشورہ کرے لیکن جس طرح چاہے کرے۔ گاندھی کے خیالات متعلق تاریخ مشاہیر پر بحث۔ اس بات پر تعجّب کہ دنیا کس طرح حقائقِ حیات سے چشم پوشی کرتی ہے۔ تمام مذاہب میں سے صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے حقائق حیات پر بہ حیثیت حقائق غور کیا ہے۔ اور ان کے مقابلے کی جرأت کی ہے۔ باقی تمام مذاہب اس خصُوصیّت سے معرا ہیں۔ قرآنِ حکیم اور احادیث کا گرُویہ ہے۔ کہ اس میں حیات کے حقائق کو حقائق سمجھ کر ان سے عہدہ برآ ہونے کے طریقے پیش کئے گئے۔ گویا زندگی (AS SUCH) سمجھا گیا ہے۔

بدُھ مذہب، بدُھ کی تعلیم۔ اس نے حقیقت میں جو کچھ کیا وہ اپنی جماعت کے استحفاظ کے لیے تھا۔ وہ کھتری تھا۔ کھتری حاکم تھے۔ وُہ جانتا تھا کہ اگر عام لوگ بغاوت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تو کھتری فنا ہو جائیں گے۔ عدم تشدّد کی تعلیم حقیقت میں اس متوقع بغاوت کو روکنے کا ذریعہ تھی گویا بدُھ نے اپنی جماعت کا مفاد محفوظ کیا۔ دُنیا کا ہر مذہب جماعتی مفاد کے تحفظ میں مصرُوف رہا۔ صرف اسلام نے ساری کائنات انسانیت کے مفاد پر نظر ڈالی۔

عیسائیت کی تعلیم "ایک گال پر طمانچہ مارا جائے تو دوسری آگے کر دو"۔ یہ شر کے ساتھ تعاون ہے۔

مراکش کے سلسلے میں عرب کی خصوصیات۔ عربوں کا جوش تبلیغ۔ عرب خود اگرچہ شمالی افریقہ تک ہی رہے۔ ان کی تعداد کم تھی۔ لیکن سارا براعظم افریقہ ان سے متاثر ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

حاکم کی مستدرک کی حدیث۔ میری اولاد میں ایک شخص ہوگا اس کا نام حسین ہوگا وہ سب کچھ تباہ کر دے گا اس کی تحقیق کرو۔ قرآن کی ترتیب والی حدیث تحقیق کرو۔

شعر، شعرا کا ذکر۔ نظیری اور غالب کا مقابلہ۔ غالب میں تخیل کی بلندی بہت ہے۔ فیلنگ کم ہے۔ نظیری غالب سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ ذکر کہ فارسی شعرا دیوان کی تختیاں ضرور پوری کرتے تھے۔ نظیریؔ کے اس شعر کا پھر تذکرہ "مشام تیر......" الخ دریغ از تو کی تعریف۔ آفت دریغ، ساخت دریغ کی تعریف۔ استغفار کی تعریف۔ "بادہ با فیروزہ خطاں تشا پوری زنؔی کی تعریف۔ صائب بھی بعض اوقات اچھے شعر لکھتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ صائبؔ، غنیؔ، ناصر علی وغیرہ استعارات بہت بیہودہ استعمال کرتے ہیں۔ ناصر علی اور غنی کی لغویات۔

شمع روشن کرد در اندام ماہی خار ہا

ناصر علی کے دو شعر:-

بہ طاعت کوش گر عشق بلا انگیز می خواہی..... الخ

دوسرا شعر بھول گیا۔

غنی فضول ہے۔ صائب کا شعر:

مجنوں بہ ریگ دشت غم دل ہمے شمرد
یاد آں زمانہ کہ غم دل حساب داشت

نظیریؔ کے اس شعر کی تعریف:-

بجمعے کہ بپردانگی نیر زندت
چو شمع تا سحر استادہ ٔ دریغ از تو

اُردو شعرا۔ میر تقی کی تعریف۔ ؎

صبح وُہ خورشید رو چمکا تو مطلع صاف تھا

سودا بہت کرتا ہے۔ ناسخ کی لغویات۔ آتش ہیں کچھ جوہر تھا۔ جرأت اچھا ہے۔ انشا بھانڈ تھا۔

ذوق کی لغویات۔ امیر مینائی ؎

گھنگرو گر رہے ہیں ٹوٹ کے پائے خیال کے

داغ۔

ناصر علی کے ہم وطن و ہم عصر محمّد زمان راسخ کی تعریف۔ آتشکدہ کی تعریف مجمع الفصحا۔

؎ علی اصغر زہنگام سفارت   چناں در دلیراست

قاآنی کا ذکر۔ فروغی کا ذکر۔

خانخاناں کے دور کے شاعر سب سے اچھے تھے۔ ہمایوں کے عہد کے ایک قلمی تذکرہ کا ذکر۔ اس کی تعریف سنی ہے نظیری کے قصائد بھی اچھے ہیں۔ تاباں وسائل کا ذکر ضمیر مرزا والالطیفہ۔ بارہ بجے کے قریب واپسی۔

---

۹ اکتوبر۔

شام کے سات بجے علی بخش کی آمد۔ طلبی۔ میری دعوت تھی۔ ساڑھے نو بجے گیا۔ فرمانے لگے ایسے شعر لکھے ہیں کہ بس مزا آگیا ہے۔ لیکن جس بات کے لیے بلایا ہے اس کے بعد سناؤں گا۔ ح کے متعلق باتیں۔ اغیار کی فریب کاریاں۔ ع

یکے بہ دزدی دل رفت و پردہ داریکے

اشعار فرمانے لگے تطہیر بشر کے لیڈر پر میرا یہ شعر لکھ دو۔

دریں صحر گزر افتاد شاید کاروانے را

پس از مدت شنیدم نالہائے ساربانے را

N . Z . ALI (نواب ذوالفقار علی خاں) کے متعلق باتیں۔ خواب لطیفہ۔ ایک روز "کارخاص" والے کی آمد۔ اس کے ساتھ "آقاؤں" کے متعلق خوشامدانہ باتیں۔ جب وہ اُٹھ کر جانے لگا۔ میں چند قدم ساتھ گیا۔ واپسی پر پوچھا تو میں نے کہا آپ ایک بات بھول گئے تھے۔ وہ میں کہنے کے لیے گیا تھا۔ وہ بات یہ تھی کہ یہ سب باتیں اچھی طرح یاد کر لینا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بات بھول جاؤ۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ عبدالکریم منشا کی تعریف قوم۔

ساڑھے دس بجے کے قریب واپسی۔

---

۱۴ اکتوبر سنہ ۲۶ء

ساڑھے نو بجے طلبی۔ جے کے متعلق باتیں۔ تذکرہ نفائس المآثر کا ذکر۔ مثنوی کے شعر۔

تا دلے صاحب دلے نالد بہ درد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

اس پر بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ حلیمہ دائی کے پاس سے رسول اللہ کی گمشدگی کے قصہ کا آخری شعر۔

پھر یہ شعر پڑھا۔ ؎

ناں برائے او دہی نانے دہد
جاں براہ او دہی جانے دہد

موسیٰ و شبان کے قصے میں سے یہ شعر ؎

بر دل موسےٰ سخن ہا ریختند
دیدن و گفتن بہم آمیختند

اس کا فلسفہ۔ ان ٹیوشن اور انٹلیکٹ کی آمیزش۔ اگر مولوی شاعر بھی ہوتا تو مثنوی قیامت برپا کر دیتی۔

اورنگ زیب۔

ONE OF THE GREATEST ADMINISTRATORS OF ASIA OR RATHER THE GREATEST ADMINISTRATOR OF WORLD.

عام دلچسپ باتیں۔ منارہ قادیانی کی تحریک کے وقت یہ کہنا کہ اس کا ذکر قرآن میں ہے۔ سورہ ہل اتیٰ میں۔ ویعرفون المنار عریضاً۔ پھر پوری سورہ بنا دی۔

پنسل۔ ..... THE TOKEN OF L.L

ایک اور L تازہ۔ M.D کا ذکر میری زبان سے۔ اخبار کا خیال۔ چوہدری کی تجویز۔ میں نے کہا آپ ساتھ ہیں تو ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہیں تم دو تو نہ نکال سکو گے اگر میں بھی ساتھ ملوں تو البتہ نکل سکے گا۔ قہقہہ .....

آج پیغام مدینہ کے تین شعر نازل ہوئے۔ خیال ہے کہ اگر چھ سات ہو جائیں گے۔ تو آپ کو (یعنی مجھے) دے دیئے جائیں گے۔ تاکہ وہاں جا کر پڑھ دیں۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب واپسی۔

حجاز جانے سے پیشتر روزنامچہ کی تحریر صرف پیر و مرشد کی ملاقاتوں تک محدود ہو گئی تھی۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو میں حجاز گیا۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو واپس لاہور پہنچا اور دوبارہ اخبار کا کام سنبھالا۔ ۱۹۲۶ء کا سارا سال بحثوں میں گزرا..... اب یکم جنوری ۱۹۲۷ء سے فیصلہ کیا گیا ہے کہ مستقلاً روزنامچہ لکھوں۔

مہر

۶ر جنوری ۱۹۲۷ء

یکم جنوری ۱۹۲۷ء

سالک اور میں سیر کے لیے باہر گئے۔ سینما LOVE THIEF۔ شام کے وقت واپسی۔ سینما کے دروازے پر علی بخش۔ پیر و مُرشد لاہور کی خدمت میں۔ باتیں۔ گلشنِ راز کا جواب۔

تو اے شاہد مرا مشہود گرداں
زفیض یک نظر موجود گرداں

دس بجے گھر

۲ جنوری ۱۹۲۷ء

پیر و مُرشد کا آدمی ایک بجے وہاں پہنچا۔ باتیں۔ مذاکراتِ علمی۔ کام اور تگ و دَو کی نسبت مشورے تاثیر صاحب سے۔ رام جوایا۔ واپسی۔ دوبارہ حاضری۔ شام کے دس بجے تک۔ افضال۔ حبیب اللہ۔ باتیں ایک زائر کی آمد اور شوقِ محبت۔ وہیں کھانا۔ وہیں بیٹھنا۔ پیر و مُرشد کے ارشادات۔ امرتسر کے سعادت علی خان فوٹوگرافر کا واقعہ۔ ایک سے تعلق، دوسری سے تعلق۔ تیسری سے تعلق۔ اللہ لبائی۔ واقعہ دعوتِ نواب۔ گانا۔ ہنسی محفلوں میں اشارے۔ ناتجربہ کار آدمی کیا کرتے ہیں۔

۴ جنوری۔

صبح پیر و مُرشد نے بُلا لیا۔ وہاں صدارت کے متعلق باتیں۔

۲۴ جنوری۔

صبح اُٹھا۔ نماز۔ علی بخش۔ چائے پی کر ڈاکٹر صاحب کے ہاں گیا۔ باتیں ابنِ سعود، توفیق شریف۔ عبدالکریم والا قصہ سنوسی کی دعوت۔ کونسل اور ارکان "کالیا" وغیرہ "کالیے" کی غلط بیانی کے متعلق استفسار، تفصیل۔ مالی کمیٹی کا معاملہ۔ پہلے مخالفت کا تہیّہ۔ پھر اصل واقعات۔ رائے بدل گئی۔ زمین کا معاملہ۔ مولانا عبداللہ آٹے والے اور ان کے رفقا مع اختر۔ عبدالرشید کے متعلق باتیں۔ قانونی مشورے۔ زبورِ عجم کی اشاعت کے انتظام کی اطلاع۔ ایک بجے رخصت۔

۲۷ جنوری

علی بخش۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے لیے نام تجویز کیے۔ یزدان نامہ، شاہد و شہود، ناز و نیاز بزمِ شہود، عبد و معبود۔ علی بخش دوبارہ آیا۔ اشتہاروں کا کہا۔

۲۹ جنوری۔

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گیا تو پروفیسر شیرانی، ایک احمد۔ اور مولانا اصغر گونڈوی بیٹھے۔ باتیں ہو رہی تھیں آپ سائیں اکبر علی شاہ کے قصّے سُنا رہے تھے۔ جو خُدائی کے دعویدار تھے۔ زبان والا۔ ایک پیر سے ملاقات۔ اکبر علی شاہ۔ توریت، زبور، انجیل۔ قرآن۔ سوال کہ کیوں لیے جاتے ہو۔ جواب۔ دُنیا نے ان کی قدر نہ کی اب واپس لیے جاتا ہُوں۔ پیر صاحب سے سوال۔ خُدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ دُنیا کو ہدایت کی۔ لیکن دنیا نہ سدھری۔ بتائیے آج جو کچھ ہو رہا ہے چوری ہے یا سینہ زوری۔ کچھ جواب نہ دیا۔ واپسی پر ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا کہ ہندوستان کا کیا ہوگا۔ جواب۔ مثال مُرغی۔ حلال (مسلمان)، جھٹکا (سکھ)، مردہ (بھنگی)

ایک روز کمرے میں بند کر دیا۔ کہنے لگا دروازہ کھولو۔ میں نے کہا کہ تم خدا ہو۔ جہاں سے چاہو نکل آؤ۔ کہا کہ اچھا دروازہ کھولو تو میں جواب دوں۔ دروازہ کھُلا۔ جواب کہ تمہیں کیسے معلوم کہ خُدا بند کمرے سے بھی بلا امداد غیر سے نکل آتا ہے۔ جواب کہ یہی کہتے ہیں کہنے لگا پھر ہر شخص سے دونی لیتا تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے چار پاؤنڈ دیئے۔ کہنے لگا کہ اقبال کے پاس امانت رکھ دو میں اس سے ہر مرتبہ دونی لے لیا کروں گا۔ جب آخری دونی لے گیا تو سُنا کہ مر گیا۔

ہند و گئے۔ نام۔ "یزدان نامہ" پسند ہے لیکن دوسرے حصّے کا نام رکھو۔ رسوم نامہ بندگی نامہ۔ بندگی نامہ کا پرستار نامہ۔ غرض نام تجویز ہوتے رہے۔ مولانا اصغر گئے تو شیخ عظیم اللہ اور مولوی انشاء اللہ آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ سورۂ کہف کی آیت کے

متعلق اعداد کا مطلب آج سمجھ میں آیا۔ نماز۔ مولوی انشاء اللہ کے سوالات۔ تناسخ۔ ڈاکٹر صاحب کے ارشادات۔ بدھ کا فلسفہ جزائے اعمال۔ قرآن میں رُوح کی حقیقت۔ ڈاکٹر صاحب کا عقیدہ کہ رُوح ہر جسم کے ساتھ بنتی ہے۔ الست بربکم۔ اس کی حقیقت کہ الست بربکم تو اب بھی ہوتا ہے۔ اسلام دنیا کے لیے بالکل نیا آؤٹ لک۔ مسلمانوں کے یونانی فلسفہ پڑھنے نے اسلام کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ تاتاریوں کے حملے نے نہیں پہنچایا۔ اسلام کا آؤٹ لک پسِ پُشت ڈال دیا گیا۔ وُہ نشو وارتقا نہ پا سکا۔ اور جو پرانا آؤٹ لک یُونانی فلسفہ سے لیا تھا اس کی رَوشنی میں اسلام کو دیکھنے لگے۔ جسٹس شاہ دین کا قصّہ۔ ولایت سے آنے کے بعد سوسائٹی۔ آبزرور میں مضامین۔ اسلام کے قانونِ وراثت پر اعتراضات کہ اس طرح جائداد جمع نہیں ہو سکتی۔ اَب ساری دُنیا کا آؤٹ لک اس سے بالکل مختلف ہے۔ ولایت میں سٹیڈ کی دعوت۔ سٹیڈ سے باتیں۔ جنّت پر اعتراضات۔ اس وقت کہیں سے تار آیا۔ سٹیڈ نے اس کا اسی وقت جواب لکھا۔ اور فخریہ مجھے سُنایا۔ تار یہ تھا کہ سٹیڈ کو ایک جلسے کی صدارت کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔ اس جلسے کی خصوصیّت یہ بیان کی گئی تھی کہ کوئی عورت شرکت کی مجاز نہ ہوگی۔ سٹیڈ نے جواب دیا NO ATOMAN NO STEAD میں نے اسی جواب کو لے کر اس کے جنّت والے اعتراضات کا جواب دیا۔ اس پر سٹیڈ پریشان ہُوا۔ کہنے لگا تم مشرقی لوگ بڑے ہوشیار ہوتے ہو۔

مولوی انشاء اللہ آج کل ہندوؤں کی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! میرے نزدیک زندگی ایک حالت ہے موت بھی ایک حالت ہے۔ جنت و دوزخ بھی ایک حالت ہیں، اور حشر و نشر بھی۔ اسلام جزو کو ایک EVENT سمجھتا ہے بہ حد PROCESS یُونانیوں کا تصوّر اعداد کے متعلق DEMARCATION کا تھا۔ موجودہ تصوّر RELATITION کا ہے۔ سورۂ کہف والی آیت یُونانی تصوّر کا رَد تھی۔ جلسہ کی صدارت کے لیے بُلایا جانا۔ تذبذب۔ اصرار پر تیاری۔ مجھے حکم عذر۔ کہنے لگے کل ضرور آنا۔

۳۰ جنوری -

مولوی عبدالعزیز آ گئے۔ تیاری۔ ڈاکٹر صاحب کی طرف۔ بھائی سُلطان آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر۔ وہاں حاجی دین محمدؐ کاتب۔ قیصر اور آلس آ گئے۔ چودھری نظموں کی تبعیض میں مصروف ہے اس سے باتیں۔ صدائے فقیر کے ایک بند کی ترتیب۔ نمازِ مغرب۔ ڈاکٹر صاحب اندر چلے گئے۔ باتیں۔ مثنویاں سُنانی شروع کر دیں۔ بندگی نامہ کا آغاز۔ گلشن رازِ جدید کا آغاز ایک گھنٹہ تک سُناتے رہے۔ شیخ اصغر علی صاحب آ گئے۔ ان سے باتیں مسلمانوں کے متعلّق حکومت کی روش کی نسبت باتیں۔ تہیّہ مضمون۔ ساڑھے آٹھ بجے شیخ صاحب گئے۔ پھر مثنویاں سنانی شروع کر دیں۔ ناموں پر بحث۔ دس بجے واپسی۔

۷ فروری -

وہاں سے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر۔ نماز۔ ملاقات۔ حج کے لیے چلو۔ عرض کیا آپ تیار ہو جائیے ہمارا کیا ہے۔ حج کا فلسفہ۔ کانگرس اور دوسرے مجامع کی مثال۔ لوگ آٹھ آٹھ ماہ پیدل سفر کر کے آتے ہیں۔ سیرتِ حضورؐ۔ واقعہ انتقال ابراہیم۔ سورج گرہن۔ صلح کی شان۔ اس واقعہ کو اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا مگر نہیں کیا۔ فتح مکّہ۔ واقعہ کلیدِ حرم۔ استدلال۔

فرائڈ کا نظریہ۔ بچّے کی خواہش۔ ماں کے پیٹ میں۔ آرٹ کو فت ہجر کو دُور کرنے کے لیے ہے۔

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روز گار وصل خویش

موسیقی۔ تعمیرات۔ شاعری وغیرہ۔ مذہب بھی قبلِ اسلام یہی حالت تھی۔ اسلام کا خاصہ۔ دوسری سمت۔ انہی کا رَد جو ماں کے پیٹ کی طرف رغبت۔ اسلامی کلچر۔ از سرِ نو اس کے مطالعہ کی ضرورت مسلمانوں کا خاصہ۔ بُت شکن کون ہیں۔ واپسی۔

(سلسلہ مطبوعات ۱)

خطوط

از مولانا غلام رسول مہر

مولانا مرحوم کے اُن مکاتیب کا مجموعہ جو انہوں نے وقتاً فوقتاً سیّد انیس شاہ جیلانی
کے نام لکھے

پہلا ایڈیشن قریب الاختتام ہے

قیمت : صرف ۳۰ روپے

○

(سلسلہ مطبوعات ۴)

غالبیات

یعنی

میرزا غالب پر مولانا غلام رسول مہر کے لکھے ہوئے متفرق مضامین کا مجموعہ

مرتّبہ

صاحبزادہ یوسف طاہر

(زیرِ طبع)

(سلسلہ مطبوعات ۵)

روزنامہ انقلاب

(منتخب اداریے)

ایک عہد کی تاریخی دستاویز

جو

کئی جلدوں پر مشتمل ہو گی

پہلی جلد تکمیل کے مراحل میں۔

عنقریب منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

○

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ایک نادرِ روزگار شخصیت

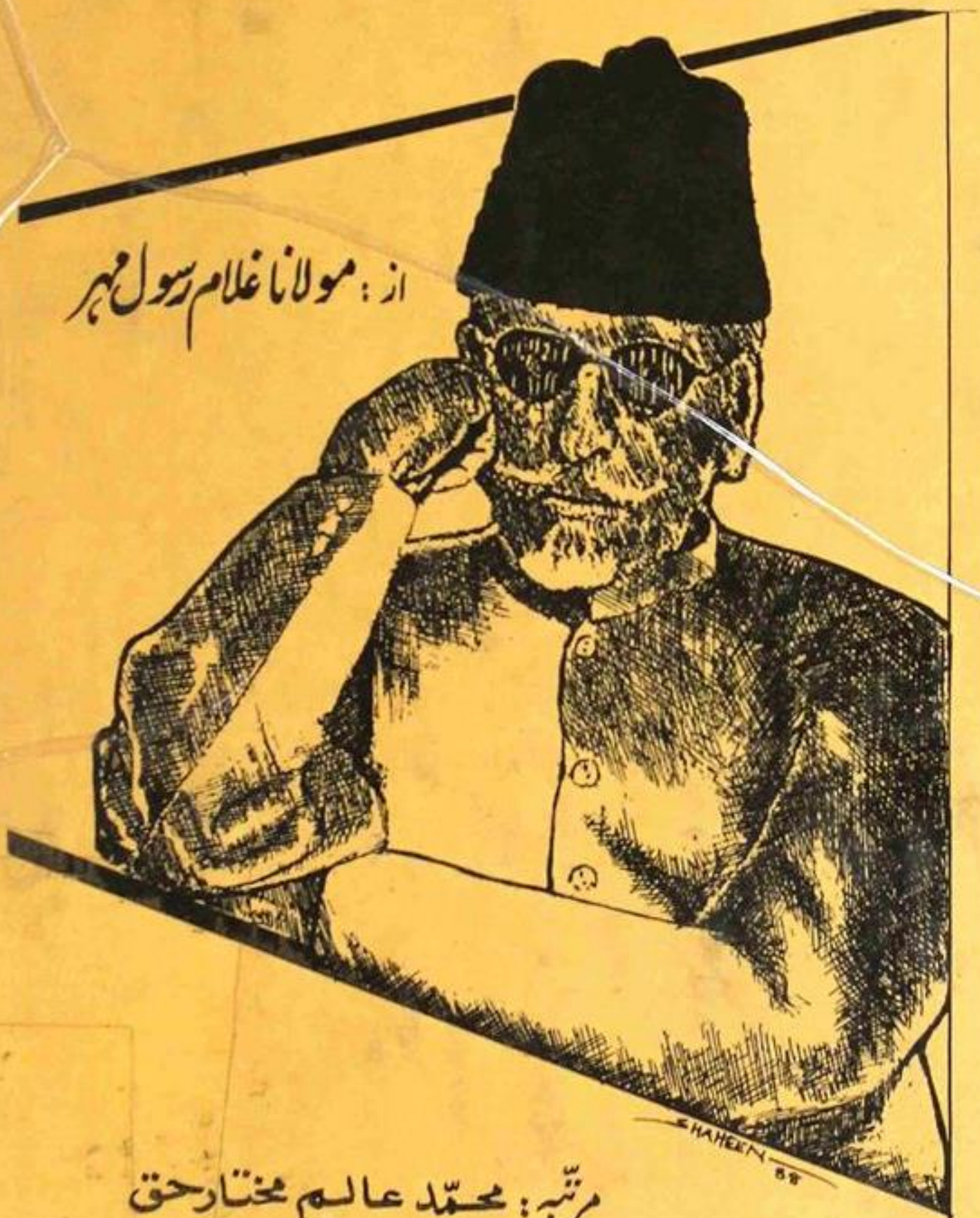

از : مولانا غلام رسول مہر

مرتّبہ : محمّد عالم مختار حق